شریف زادہ

مرزا ہادی رسوا

مرتب

حفیظ عباسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1977
پانچویں طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/12 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	294

Shareef Zada

by

Mirza Hadi Ruswa

ISBN :978-81-7587-390-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025

فون نمبر: 49539000، فیکس 49539099

ای میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آ جاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آ جاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

1

ہمارے دوست مرزا عابد حسین کے والد مرحوم مرزا باقر حسین صاحب حضرت عباس کی درگاہ کے پاس کہیں رہتے تھے۔ پکا مکان تھا۔ نواب صاحب کی سرکار سے دس روپے مہینہ وظیفہ پاتے تھے۔ اس میں اللہ نے ایسی برکت دی تھی کہ ان کی آرام سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ بیوی کے پاس گہنا بھی تھا۔ گھر میں ضروری سامان بھی موجود تھا اور وقت بے وقت ضرورت پڑنے پر صندوقچے میں سے دس بیس روپے بھی نکل آتے تھے۔ گھر میں کام کاج کے لیے ماما نوکر تھی۔ کوئی تقریب ہوتی تو کنبہ جڑتا، ڈومنیاں آتیں، خوب رونق رہتی۔ شادی کے ایک سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دھوم دھام سے چھٹی منائی گئی۔ اس کا عابد حسین نام رکھا گیا۔ ہوش سنبھالا تو مولوی صاحب سے فارسی پڑھنے لگے۔ اسکول میں انگریزی پڑھنے جاتے تھے۔

عابد حسین مڈل کلاس تک پہنچے تھے کہ ان کے والد مرزا کا انتقال ہو گیا۔ اب تو گھر کے انتظام کا سارا بوجھ عابد حسین پر آ پڑا۔ البتہ خرچ کی طرف سے ذرا سا اطمینان تھا۔ وہ یوں کہ نواب صاحب کی سرکار سے سات روپے مہینہ ان کی والدہ کو ملتا تھا لیکن ابھی سال پورا نہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کربلائے معلیٰ کی زیارت کو چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس وقت عابد حسین دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ آمدنی ختم ہوئی تو ایک ایک کر کے گھر کا سامان بکنے لگا۔ اب ساری امید اس بات پر تھی کہ عابد دسواں پاس کریں تو کچھ کریں اور گھر کو سنبھالیں۔ شادی بھی ہو چکی تھی۔ امتحان کی فیس جمع ہونے کا وقت آیا تو بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ کر فیس جمع کی۔ اب منزل قریب تھی۔ امتحان سے دو دن پہلے والدہ کو ہیضہ ہوا اور ٹھیک اس دن والدہ کا انتقال ہوا جس دن انہیں امتحان

•

میں شریک ہونا تھا۔ اس طرح بیچارے امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ ساری محنت بیکار گئی۔
ماں کے مرنے کے بعد تو گھر کا سارا بوجھ انہیں پر آ پڑا۔ ماں کے جیتے جی گھر کا سارا سامان بک چکا تھا۔ جو بچا تھا وہ ان کے کفن دفن کے لیے بیچنا پڑا۔ اب گھر میں رتی بھر سامان نہیں بچا جسے بیچ ڈالتے یا گروی رکھ دیتے۔ گھر میں ایک خود، ایک بیوی، ایک تین برس کا بچہ، چھ مہینے کی ایک بچی گود میں۔ روزگار کی کوئی صورت نہیں مگر ہمت کر کے پڑھتے جاتے تھے۔ امتحان کے چھ مہینے باقی تھے۔ کچھ نہ بن پڑا تو نتو کنجڑے کے پاس سو روپے میں مکان رہن رکھا۔ مکان رہن رکھنے کے ساتھ ہی اس کنجڑے کو مکان کا قبضہ دینا پڑا۔ آخر کرائے کے مکان میں آ رہے۔ یہ مکان کچا سا تھا اور محمود نگر میں نالے کے پاس تھا۔ کرایہ ایک روپیہ مہینہ تھا۔ یہ تکلیف اپنی جگہ رہی مگر خرچ کی طرف سے امتحان تک کے لیے تو بے فکر ہو گئے۔ جی توڑ محنت کی۔ اللہ کے کرم سے پاس بھی ہو گئے۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔

نوکری کی تلاش میں ایک دن گھر سے نکلے۔ منہ اترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئی، فاقوں سے نڈھال۔ کمزوری کے مارے قدم نہ اٹھتا تھا۔ دل میں کہتے تھے افسوس آج بیوی بچوں کا دوسرا فاقہ ہے۔ راستے میں جو لوگ نظر آتے تھے سب خوش و خرم تھے۔ دکانیں ترکاریوں اور میووں سے بھری ہوئی تھیں۔ نان بائی گرم گرم شیرمال اور خمیری روٹیاں تنور سے نکال رہے تھے۔ نہاری کے پتیلے سے خوشبو نکل رہی تھی۔ نجو کی دوکان پر تازہ تازہ حلوہ سوہن رکھا تھا۔ حلوائیوں کی دکانیں پوریوں، کچوریوں، حلووں اور مٹھائیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے تھے اور بیوی بچوں کے فاقوں کو یاد کر کے تڑپ جاتے تھے۔ صراف کی دکان پر روپے کھنکتے تھے تو انہیں خیال آتا تھا کہ ایک روپیہ ہوتا تو بیوی بچوں کی بھوک مٹ جاتی۔

میٹرک کا سرٹیفکیٹ جیب میں تھا مگر بیکار۔ سوچتے تھے شیرہ میسر ہوتا تو اسے لگا کے

جانتے ورنہ یہ اور کس کام کا۔ مڈل کر کے رڑکی کالج چلے گئے ہوتے تو یہ حال کیوں ہوتا۔ رام چرن کا خیال آیا جس نے ان کے ساتھ ہی مڈل پاس کیا تھا اور اب رائے بریلی میں سب اوورسیر تھا۔ میڈیکل کالج نہ جانے کا بھی بڑا افسوس تھا۔ غرض تین سال اکارت گئے مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ انہیں خیالوں میں کھوئے ہوئے لڑکھڑاتے، ٹھوکریں کھاتے گول دروازے تک پہنچ گئے۔ اس وقت دس بج رہے تھے جو لوگ دفتروں میں نوکر تھے وہ اکوں پر سوار ہو ہو کے اپنے اپنے دفتر جا رہے تھے۔ دو ایک اکے والوں نے انہیں بھی ٹوکا مگر ان کی جیب میں پیسہ کہاں تھا۔ چپکے ہو رہے اور سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلتے رہے۔

میاں تو نوکری ڈھونڈنے نکل گئے۔ اب بیوی کا حال سنیئے۔ وہ بیچاری صبح سے اٹھ کے ٹوپی کاڑھنے میں لگ گئی۔ ایک پلا تو کئی دن سے تیار تھا۔ دوسرے میں کچھ کام باقی تھا۔ دونوں تیار ہو گئے تو یہ فکر ہوئی کہ یہ کسی طرح بک جائیں۔ مکان میں ایک کھڑکی تھی جو پڑوس کے ایک گھر میں کھلتی تھی۔ وہاں جا کے ہمسائی کو پکارا۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی۔

عابد حسین کی بیوی: ہمسائی! تمہارے میاں گھر میں ہیں؟

ہمسائی: ہاں ہیں۔ کیا ٹوپی تیار ہو گئی؟

عابد حسین کی بیوی: ہاں تیار ہو گئی۔ ذرا اپنے میاں کو تو دکھا دو۔ اگر یہ بک جائے تو بڑا کام بنے۔ (ہمسائی ٹوپی لے کر اپنے میاں حسین علی کے پاس گئی۔

میاں: اچھا یہ ٹوپی تیار ہو گئی۔ اچھی بنی ہے۔

بیوی: یہ کتنے پیسوں میں بک جائے گی؟

میاں: صحیح قیمت تو بازار میں دکھانے پر ہی معلوم ہو گی۔ میرے اندازے سے تو دس گیارہ آنے کی ہو گی۔

بیوی: اچھا تو جاؤ بازار جا کے اسے بیچ آؤ۔ بیچاری کے گھر میں آج تیسرا فاقہ ہے۔ بچے غش

کی حالت میں پڑے ہیں۔

میاں: ارے تیسرا فاقہ ہے۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔ میں بنیے کی دکان سے کچھ لا دیتا۔

بیوی: آہستہ بولو کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ سُن نہ لیں۔ بڑے غیرت والے لوگ ہیں۔ مر جائیں گے مگر کبھی منہ سے نہ کہیں گے۔ کسی سے قرض ادھار لینے کے بھی روادار نہیں۔ جس دن فاقہ ہوتا ہے بچوں کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتے کہ کہیں گھر کی بات باہر نہ نکل جائے۔

میاں: اچھے گھرانے کے لوگ ہیں۔ ان کے والد کے تو اور ہی ٹھاٹھ تھے۔ آج بیچارے مصیبت میں ہیں۔ اچھا لاؤ میں ٹوپی بیچ آؤں۔

میاں حسین علی نے الگنی پر سے انگرکھا اتار کے پہنا۔ ٹوپی اوڑھی اور وہ ٹوپی جیب میں رکھ کے گھر سے نکلے۔ پارچے والی گلی میں پہنچ کر دو ایک دکانداروں کو ٹوپی دکھائی۔ کسی نے گیارہ آنے لگائے، کسی نے بارہ آنے۔ ایک صاحب شوقین مزاج ایک دکان پر ٹوپیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر جو اس پر پڑی تو انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ یہ تھوڑی دور جا کے کھڑے ہو گئے۔ ذرا دیر میں وہ صاحب آ گئے۔

خریدار: ہاں صاحب۔ یہ ٹوپی کتنے کو دیجیے گا۔

حسین علی: یہ مال میرا نہیں جس کا ہے اس نے کہا ہے کہ ایک روپے سے کم پر نہ دینا۔ چاہے بکے چاہے نہ بکے۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ چاہے لیجیے چاہے نہ لیجیے۔

خریدار نے پہلے تو ذرا بحث کی۔ آخر ایک روپے پر ہی معاملہ طے ہوا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب بھی ایسی ٹوپی تیار ہوا کرے بس مجھی کو دیا کیجیے۔ اس نے اپنا پتہ اچھی طرح انہیں سمجھا دیا۔ یہ روپیہ لے کر خوش خوش گھر کو لوٹے۔ ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جو دوسروں کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ مغرور آدمی انہیں حقارت سے دیکھتے ہیں۔ بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ان بیچاروں نے اعلا درجے کی وہ تعلیم نہیں

•

پائی جو خود غرضی سکھاتی ہے۔ ظاہرداری اور بناوٹ انہوں نے نہیں سیکھی جو انسانیت کے اصلی جذبات کو چھپا دیتی ہے۔ انہوں نے وہ فلسفہ نہیں پڑھا جو مذہبی عقائد کی بنیادیں ہلا دیتا ہے اس لیے عام طور پر انہیں جاہل سمجھا جاتا ہے۔

حسین علی نے روپیہ لا کے بیوی کو دیا۔ وہ خوشی خوشی دوڑ کے کھڑکی کے پاس گئیں اور عابد حسین کی بیوی کو بلا کے روپیہ اس کے حوالے کیا۔ وہ اتنی احسان مند ہوئی کہ اسے لکھا نہیں جا سکتا۔ اس ایک روپے کی قدر اسی کو ہو سکتی ہے جس کے بچوں نے دو دن سے کچھ نہ کھایا ہو اور جس کا شوہر روز بھوکا پیاسا نوکری کی تلاش میں نکل جاتا ہو اور شام کو مایوس لوٹ کے چپکا سو رہتا ہو۔ اس بیچاری نے فوراً وہ روپیہ بھنایا اور اناج منگا کے بچوں کو روٹی کھلائی مگر خود کچھ نہ کھایا۔ بھلا جب تک میاں کو نہ کھلا دے خود بیچاری کیسے کھا لے۔ اب دوسری ٹوپی کی کڑھائی شروع کر دی مگر بھوک کے مارے یہ حال ہے کہ ٹانکا بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔

اب عابد حسین کا حال سنیے۔ بیچارے نے دن بھر میں کئی دفتروں کا چکر لگایا۔ کتنے ہی بنگلوں پر حاضری دی مگر ہر جگہ ایک ہی جواب ملا کہ جگہ خالی نہیں ہے۔ سنا تھا کہ گوروں کو اردو پڑھانے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہاں بھی گئے مگر نہ اپنی کہہ سکے نہ ان کی سمجھ سکے۔ یوں کہ انگریزی پڑھی ہی کتنی تھی۔ غرض اسی میں شام ہو گئی اور امید ناامیدی میں بدل گئی۔ مایوس ہو کر گھر کو لوٹے۔ بھوکے بیوی بچوں کا خیال آیا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔

بھوک کی کمزوری دوسرے مایوسی۔ چکر آیا تو سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔ اب اٹھا نہیں جاتا۔ یہ بھی سوچا کہ گھر جا کے کریں گے کیا۔ موتی محل کے پل کی منڈیر سے دریا میں گر پڑو۔ مایوسی کی یہ رائے پسند آئی مگر ساتھ ہی بیوی بچوں کا خیال آیا کہ انہیں سہارا دینے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس خیال سے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ سوچا اور کچھ

نہ سہی میری وجہ سے امید تو بندھی ہوئی ہے۔ پھر خیال آیا کہ شرم کو چھوڑ کر محنت مزدوری کرنی چاہیے۔ اس زمانے میں نوکری ملنی تو ممکن نہیں۔ پھر محنت کرنے میں برائی ہی کیا ہے۔ شام کو دو آنے ملیں گے تو بچے فاقوں سے تو بچیں گے۔ دوسرے یہ کہ جو مکان گردی رکھ چھوڑا ہے اسے بیچ ڈالنا چاہیے۔ دس بیس روپے بڑھیں تو اس سے نخاس میں کاٹھ کباڑ کی دکان رکھی جا سکتی ہے۔ شاید اس طرح ہی گزر ہو جائے۔

اسی سوچ بچار میں تھے کہ ایک گنوار سا آدمی پاس آ بیٹھا اور اس نے ان سے ایک خط پڑھنے کو کہا۔ وہاں روشنی نہ تھی۔ یہ اُٹھ کے سڑک کی لالٹین کے پاس آ گئے اور خط پڑھ دیا۔ یہ ایک کاروباری خط تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ایک ہزار روپے کا لوہا بلدیو مستری کے ذریعے خرید کر بھیج دو۔ پھر سامان کی فہرست تھی۔ جب یہ خط پڑھ چکے تو اس نے خوشامد کی کہ بلدیو مستری کا کارخانہ پاس ہی ہے وہاں چل کے اس کا جواب لکھ دیجیے۔ انہوں نے بہت کہا کہ رات ہو جائے گی مجھے دُور جانا ہے مگر وہ خوشامد کیے گیا کہ میں اکے پر سوار کرا کے بھیج دوں گا۔ انہوں نے بھی سوچا کہ چلا نہیں جاتا۔ چلو یوں ہی سہی۔

عابد حسین اس کے ساتھ بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچے۔ یہ ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ چاروں طرف کھپریلیں تھیں۔ صحن میں لوہے، پتھر اور کوئلے کے ڈھیر تھے۔ لئی بھٹیاں تھیں جن کے آگے دھونکنی چل رہی تھی۔ بھٹی سے سرخ سرخ لوہا نکلتا تھا اور ہتھوڑوں سے کٹ پس کر اپنی شکل بدل لیتا تھا۔ ایک کھپریل میں دو تین لکڑی کے صندوق پڑے تھے۔ ایک چارپائی بچھی تھی۔ ایک صندوق کے اوپر ایک بوڑھا مگر صحت مند آدمی بیٹھا تھا۔ یہی بلدیو مستری معلوم ہوتا تھا۔

عابد حسین کو ایک صندوق پر بٹھا دیا گیا۔ چراغ لا کے آگے رکھ دیا گیا۔ جو شخص انہیں بلا کے لے گیا تھا۔ اس نے کہا "ذرا مستری جی کو یہ خط پڑھ کر پھر سنا دیجیے" انہوں نے وہ خط پڑھ کے سنایا۔ اس کے بعد جواب لکھنے کے لیے قلم دوات کی ضرورت ہوئی۔ بلدیو

نے کہا " مادھو بھیّا سے مانگ لو ۔" اُسے آواز دے کر بلایا گیا ۔ یہ مادھو بلدیو کا لڑکا تھا ۔ کوئی چودہ پندرہ برس کا ہوگا ۔ سامنے دوسری کھپریل تھی ۔ وہاں میز کرسی لگی تھی ۔ میز پر لیمپ جل رہا تھا ۔ کتابیں لگی ہوئی تھیں ۔

جب قلم دوات آگیا تو عابد حسین جواب لکھنے لگے ۔ اس میں بڑی دیر لگی کیوں کہ طرح طرح کے لوہے کا بھاؤ ، وزن اور قیمت لکھنی ہوتی تھی ۔ حساب لگانے میں مادھو بھی مدد کرتا گیا ۔ بیچ میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ عابد حسین کس مصیبت میں گرفتار ہیں ۔ نہیں تو شاید جلدی کرتے ۔ نام پتہ قسم کی دو چار باتیں اُن سے پوچھی گئیں مگر اُن میں سب سے زیادہ دلچسپی مادھو کو تھی ۔ وہ انگریزی پڑھتا تھا اور باتوں باتوں میں اب یہ پتہ تو چل ہی گیا تھا کہ عابد حسین میٹرک پاس ہیں ۔ مادھو بھیّا ابھی مڈل کلاس سے بھی دو درجے نیچے تھے ۔ فارسی تحریر بھی خراب تھی ۔ اس لیے آج ہی دو نمبر اُتار دیے گئے تھے ۔ عابد حسین نے خط لکھا تو معلوم ہوا کہ ان کی تحریر بہت ہی عمدہ ہے ۔ انہیں باتوں کی وجہ سے مادھو کے دل میں عابد حسین کی بڑی عزت ہو گئی تھی ۔

میٹرک پاس کا نام سن کر بلدیو مستری بھی چونک پڑے تھے ۔ میٹرک اور مڈل کے نام سے وہ بھی اچھی طرح واقف تھے ۔ مادھو کو جب سے داخل کرایا تھا یہ دونوں نام ان گنت مرتبہ سنے تھے ۔ پہلے تو یہ مڈل کو ہی بڑی بات سمجھتے تھے ۔ لیکن جب پرشادی بابو ریل کے دفتر میں دس روپے کے نوکر ہوئے تو ان کی نظر میں مڈل کی عزت گھٹ گئی ۔ پھر یہ سنا کہ بڑے بابو جو لوکو آفس میں نوکر ہیں بڑی تنخواہ پاتے ہیں اور میٹرک پاس ہیں تو میٹرک کی عزت ان کے دل میں گھر کر گئی ۔ ماسٹر جانکی پرشاد جو مادھو کو انگریزی پڑھانے آتے تھے ، اب وکیل ہو گئے ۔ گنپت بڑھئی کا لڑکا چھوٹے لال میٹرک پاس کرکے رُڑکی چلا گیا تھا اب اوور سیر ہے ۔ اب تو ان کی ساری امیدیں اس بات پر تھیں کہ کسی طرح

مادھو میٹرک پاس کر کے بڑا آدمی بن جائے۔

اچانک بلدیو نے عابد حسین سے پوچھا "آپ رہتے کہاں ہیں؟" انہوں نے بتایا "چوک کے پاس"۔ اس پر بلدیو نے افسوس کیا کہ آپ بہت دور رہتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کیوں کیا بات ہے؟"

بلدیو: کچھ نہیں۔ مکان پاس ہوتا تو مادھو بھتیا گھنٹہ دو گھنٹہ آپ سے پڑھ لیا کرتا۔ عابد حسین تو روزگار کی تلاش میں تھے ہی۔ چاہتے تھے تھوڑا بہت ہی کچھ سہارا ہو جائے بولے میں تو ادھر نوکری کی تلاش میں آیا ہی کرتا ہوں، انہیں پڑھا بھی دیا کروں گا۔ بلدیو اس جواب سے مطمئن ہو گئے اور بولے کہ میں ماسٹر جانکی پرشاد کو پانچ روپے دیا کرتا تھا وہی آپ کو بھی دیا کروں گا۔ انہوں نے اگلے دن صبح سات بجے آنے کا وعدہ کر لیا اور روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ جو شخص عابد حسین کو خط لکھوانے کے لیے بلا کر لے گیا تھا اس نے اکّہ لانے کے لیے کہا مگر پتہ چلا کہ اکّے والا کہیں سواری لے کر گیا ہے اس لیے اس نے ایک چونّی دی کہ حسین گنج سے اکّہ کر لیجیے گا۔ انہوں نے سوچا کہ چونّی لینے سے کہیں عزت کم نہ ہو جائے اس لیے چونّی واپس کرنے لگے مگر بلدیو مستری نے کہا "لے لیجیے رات زیادہ ہو گئی ہے آپ کو پھر صبح سویرے آنا ہے۔" عابد حسین نے وہ چونّی لے کر جیب میں رکھی اور رخصت ہو گئے۔

راستے میں بہت سے اکّے ملے۔ چلنے کی طاقت نہ تھی مگر بیوی بچوں کا خیال آیا۔ انہیں بھوکا چھوڑ آئے تھے، سوچا چار آنے سے دو وقت ان کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر پیدل ہی چلتے رہے۔ چار آنے کا سہارا بھی بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اب تیز تیز قدم اٹھنے لگے۔ دس بجے گھر پہنچے۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ گھر میں چراغ جلتے دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی کہ تیل کہاں سے آیا۔ ان کے بیٹھتے ہی بیوی نے دسترخوان بچھا دیا۔ اب تو اور بھی حیران ہوئے۔ پوچھنے پر بیوی نے بتایا کہ وہ ٹوپی مکمل ہو گئی تھی۔ وہ بکی تو

کھانے پینے کا سامان آیا اور اللہ کے کرم سے بچّے دونوں وقت کھانا کھا کے سو رہے۔ ہاں بیوی نے میاں کے انتظار میں ابھی تک کچھ نہ کھایا تھا۔ انہوں نے ان کے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی انہوں نے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنایا۔ وہ بھی سُن کے باغ باغ ہو گئی۔ وہ بیچاری اُن بیویوں میں سے نہ تھی جو خواہ مخواہ شوہر کی شکایت کیا کرتی ہیں۔ بلکہ اس نے تو مصیبت میں طرح طرح دلجوئی کی۔ ہمت بندھائی۔ آج بھی جب عابد حسین نے کہا کہ پانچ روپے میں کیا ہوگا تو اس نے یہ کہہ کر ہمت بندھائی کہ تھوڑا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ٹوپی ایک روپے کو جانے لگی ہے۔ مہینے میں چار بھی چلی گئیں تو چار روپے تو یہی ہو گئے۔ غرض میاں بیوی دونوں نے کھانا کھایا اور خدا کا شکر ادا کر کے سو رہے۔

اگلے دن صبح ہی صبح مرزا صاحب بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچ گئے۔ مادھو پڑھنے کا شوقین تھا۔ وہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی کتابیں سجا کر بیٹھ گیا تھا۔ مرزا صاحب نے پہلے انگریزی پڑھائی۔ لفظوں کا املا بتایا۔ تلفظ سکھایا۔ معنی اور استعمال سمجھایا۔ پھر انگریزی قواعد پڑھائے۔ اس کے بعد اردو کا نمبر آیا۔ اردو میں مادھو بہت کمزور تھا۔ اس میں عابد حسین کو بہت محنت کرانی پڑی۔ پھر حساب کا نمبر آیا اور اس کے بعد فارسی کا۔ غرض دو گھنٹے تک نہ استاد کو مہلت ملی نہ شاگرد کو۔ بلدیو بھی بہانے بہانے سے کھپریل میں آکر اُن کا پڑھانا دیکھتا رہا۔ جب وہ پڑھانے سے فارغ ہوئے تو بلدیو مستری نے اپنے کارخانے کا تھوڑا احتساب کتاب کرایا۔ اس کے بعد یہ گھر کو روانہ ہوئے۔

عابد حسین بلدیو مستری کے کارخانے سے لوٹے تو یہ بات ان کے دل میں گھر کر چکی تھی کہ محنت مشقت بڑی عزت کے قابل ہے۔ بھاری ہتھوڑوں اور دھونکنیوں کی آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ لوہے کا سرخ ہو کر بھٹی سے نکلنا اور نہائی پر رکھا جانا۔ پھر مضبوط ہاتھوں کی چوٹوں سے شراروں کا اڑنا اُن کے دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔ محنت اور جفاکشی کی مجسم صورتیں آنکھوں میں پھر رہی تھیں۔ آرام طلب اور کاہل لوگوں نے

محنت کرنے والوں کو ہمیشہ کم رتبہ کہا ہے۔ انہیں آج یہ بات بڑی احمقانہ لگ رہی تھی۔

بلدیو مستری کے کارخانے میں کسی کا روزینہ چھ آنے سے کم نہ تھا۔ ان بیچارے نے اپنا حساب لگایا تو ڈھائی آنے روز کے قریب بیٹھا۔ ایسا خاندانی گھمنڈ بھی کس کام کا جو کسی کام کا نہ چھوڑے۔ باپ دادا کے عہدوں کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ دادا جان رسالہ دار تھے مگر وہ رسالہ غدر سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ نانا جان کا تعلق ایک نوابی خاندان سے تھا مگر نوابی چھن گئی تھی اور صرف پنشن رہ گئی تھی۔ دادی اماں کے پاس چالیس لونڈی غلام تھے مگر اب ان کی بیوی کو خود چولھا جھونکنا پڑتا تھا۔ ماموں کی سواری میں ہاتھی رہتا تھا اور اب یہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے۔ پانچ روپے کی نوکری ان کے لیے ایسی تھی کہ اس کے لیے سویرے اٹھ کے محمود نگر سے نہر کے اس پار کوئی تین میل دور پیدل جاتے اور پھر دس بجے لوٹتے۔

فاقوں کی نوبت آئی تو خاندان کا نام کام نہ آیا۔ یہ جو دو حرف پڑھ لیے تھے تو ان کی بدولت پانچ روپے کا سہارا ہو گیا۔ اس لیے دل نے کہا اب خاندان کا بے جا غرور کام نہ آئے گا۔ اسے رخصت کرو اور گنگا پار کا راستہ بتا دو۔ یہ سوچتے چلے جاتے تھے کہ خیال آیا گھر جانا تو ہے ہی حضرت گنج کی طرف سے نکل چلو۔ کل آڈٹ آفس میں عرضی دی تھی۔ معلوم تو یہی ہوا تھا کہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں مگر یہ بھی بابو نے کہا تھا کہ عرضی صاحب کے سامنے پیش کر دیں گے۔ لاؤ دیکھیں کیا حکم ہوا۔ ابھی یہ نہر کا پل پار کر ہی رہے تھے کہ ایک کباڑی کی دکان پر کتابیں رکھی نظر آئیں جیب میں چونی بھی تھی مگر تنگدستی نے قدم روک لیے۔ آڈٹ آفس کا راستہ آیا اور انہوں نے اس طرف مڑنے کا ارادہ بھی کیا مگر خیال آیا کہ وہاں گیارہ بجے سے پہلے کون آتا ہے۔ ابھی تو سویرا ہے۔ اس لیے گھر کی طرف ہی چل دیئے۔

راستے میں جتنے لوگ دکھائی دیے تیزی سے چلتے ہوئے، چہروں پر غور اور سنجیدگی کے آثار۔ لباس میں سادگی۔ چال میں تیزی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مصروف آدمی ہیں اس

علاقے میں کوئی فقیر بھی دکھائی نہ دیا۔ امین آباد سے نکل کے مولوی گنج میں داخل ہوئے تو ایک دوسری ہی دنیا آنکھوں کے آگے تھی۔ کتنے آدمی بٹیروں کی کابک لیے ملے۔ کوئی گنا چھیلتا چلا جارہا ہے۔ کوئی کسی پر پھبتی کر رہا ہے۔ کوئی ہنسی دل لگی میں مشغول ہے، کہیں گالی گلوج ہو رہی ہے تو کہیں مار پیٹ۔ کہیں بندر کا تماشا ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ نکموں، بے فکروں کی دنیا ہو جنھیں وقت برباد کرنے کے سوا کچھ کام نہیں۔ کتنے آدمی صورت سے فاقوں کے مارے اور مصیبتوں کے ستائے نظر آتے تھے، یہاں فقیروں کی بھی کثرت تھی۔

عابد حسین یہ رنگ برنگے تماشے دیکھتے ہوئے گھر پہنچے۔ کھانا تیار رکھا تھا۔ بچے کھیل کود میں لگے تھے۔ بیوی بیٹھی ٹوپی کاڑھ رہی تھیں۔ ان کے پہنچتے ہی دستر خوان بچھ گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ اب گیارہ بج رہے تھے۔ اس وقت سے اگلے دن چھ بجے صبح تک انیس گھنٹے باقی تھے۔ رات کے سونے کے سات گھنٹے نکال کر بھی بارہ گھنٹے بچتے تھے۔ نکمے آدمیوں کے لیے وقت ضائع کرنے کے بہت بہانے ہوتے ہیں مثلاً گیارہ بجے سے تین بجے تک سو لیے، اٹھے تو تین بجے سے پانچ بجے تک نہانے دھونے، بالوں میں کنگھی کرنے، تیل ڈالنے، مانگ پٹیاں درست کرنے اور کپڑے بدلنے میں مصروف رہے۔ پھر چوک کی سیر کو نکل گئے۔ سات بجے تک وہاں واہی تباہی پھرے۔ اب کسی دوست سے ملاقات کا وقت آگیا۔ وہاں پہنچے تو باتیں ہونے لگیں یا گنجفہ، شطرنج، چوسر کی بازی جم گئی۔ یہ بھی تین چار گھنٹے اور کٹ گئے۔ غرض یہ کہ وقت کا برباد کرنا کوئی مشکل کام ہے مگر ہمارے دوست عابد حسین اس طرح کے لوگوں میں سے نہ تھے۔ انھیں تو اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر تھی۔ تقدیر کی شکایت کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ نجومیوں سے آنے والے دنوں کا حال پوچھنا انھیں پسند نہ تھا۔ وہ تو اپنے عمل اور اپنی محنت پر بھروسہ کرتے تھے۔

انھوں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک ایک پل سونے کے ریزے کے برابر قیمتی ہے۔ اسی وقت

سے وہ ان ریزوں کو جمع کرنے اور اس سے سونے کی تھیلیا بنانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ فرصت کا وقت پایا تو انٹرنس کی کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ بعض چیزیں پڑھنے سے رہ گئی تھیں انہیں دیکھتے رہے۔ اس بات کا بڑا ملال تھا کہ ایف۔ اے میں داخلہ نہ لے پائے۔ نہ فیس ادا کرنے کی حیثیت تھی اور نہ کتابیں خریدنے کی۔ اور اگر اب ہوتی بھی تو چھ مہینے گزر گئے۔ ساتھی کہاں سے کہاں جا پہنچے ہوں گے۔

عابد حسین کو آج اپنی غربت پر بڑا صدمہ تھا۔ اس کم بخت نے اُن کی ترقی کے سارے راستے روک دیے تھے۔ ایک بجنے والا تھا۔ یہ آؤٹ آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں وہی گھسا پٹا جواب ملا۔ نو ویکینسی یعنی کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ امید بھی یہی تھی۔ اس لیے انہیں ملال نہ ہوا۔ یہ لوٹنے ہی والے تھے کہ انہیں اپنے اسکول کے زمانے کا ایک ساتھی ملا۔ اس کا نام رضا حسین تھا۔ بات چیت کے دوران پتہ چلا کہ وہ وہیں ملازم ہے اور ٹریسر کا کام کرتا ہے۔ اُن کے کہنے پر وہ انہیں دفتر میں لے گیا۔

دفتر میں کئی اونچی اونچی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ اُن پر نقشے بچھے ہوئے تھے۔ نقشوں کے اوپر ایک قسم کا باریک موم جامہ یعنی ٹریسنگ کلاتھ بچھا کر پیتل کی کیلوں سے جڑ دیا تھا۔ نیچے کا نقشہ اس موم جامے کے اوپر سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اوزاروں کے بکس کھلے رکھے تھے۔ کچھ لوگ بیٹھے اور کچھ کھڑے لکیروں کے اوپر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ کچھ رنگوں کی پیالیاں آگے رکھے رنگ بھر رہے تھے۔ انہوں نے جس سے بھی سوال کیا اس کا جواب محبت سے ملا۔

ابھی عابد حسین یہ سب کچھ دیکھ ہی رہے تھے کہ چپراسی نے صاحب کے آنے کی خبر دی۔ انہوں نے دفتر سے باہر جانے کا ارادہ کیا مگر اُن لوگوں نے کہا "آپ ٹھہریے۔ کوئی بات نہیں۔ صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔" صاحب آئے۔ لوگوں سے کام کے بارے میں پوچھتے رہے۔ عابد حسین سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ یہ گھبرائے مگر رضا حسین نے جواب دیا "میرے

پاس آئے ہیں "۔ صاحب نے پوچھا " ٹریسر کا کام جانتے ہیں؟" انہوں نے کہا "سیکھتے ہیں"۔

صاحب کے جانے کے بعد عابد حسین رضا حسین سے بولے "تم نے یہ خوب کہا کہ کام سیکھتے ہیں"۔ انہوں نے کہا "اور کیا کہتا"۔ اس پر عابد حسین بولے "واقعی میں اگر کام سیکھوں تو سکھا دوگے؟" انہوں نے کہا "استاد نبی بخش سے کہو"۔ استاد نبی بخش رڑکی کے سند یافتہ نقشہ نویس تھے۔ پاس ہی بیٹھے کام کر رہے تھے۔ بولے "مٹھائی کھلانی ہوگی"۔ انہوں نے کہا "ضرور کل مٹھائی لیتا آؤں گا"۔ مگر رضا حسین نے اسی وقت جیب سے نکال کے نور وز علی چپراسی کو ایک روپیہ دیا، ذرا دیر میں ٹوکری بھر کے مٹھائی آگئی۔ سب کو تقسیم ہوئی اور اسی وقت عابد حسین نبی بخش کے شاگرد ہوگئے۔

نبی بخش نے انہیں بتایا کہ ٹریسنگ کا کام کچھ مشکل نہیں۔ آٹھ دن سیکھنے کے بعد آپ بیس روپے مہینہ کے نوکر ہو جائیں گے۔ رہی نقشہ نویسی تو یہ مشکل کام ہے۔ اسے سیکھنے کو عرصہ چاہیے۔ جتنی میں سکھا سکتا ہوں سکھا دوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے ٹریسنگ کلاتھ نکال کے ان کے سامنے پھیلا دیا۔ اور قلم ہاتھ میں دے کر لکیریں کھینچنا سکھایا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ان کے قلم سے اچھی خاصی لکیریں نکلنے لگیں۔ منشی نبی بخش نے ان کا انگریزی خط دیکھا تو نہایت عمدہ تھا۔ انہوں نے چھاپے کے حروف لکھنے بھی بتا دیے۔ چار بجے تک انہوں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ چھٹی ہوئی تو یہ ایسے اطمینان سے دفتر سے نکلے جیسے سچ مچ نوکر ہوگئے ہوں۔

2

مرزا عابد حسین کو زندگی میں قدم قدم پر کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ اِن کامیابیوں میں اُن کی نیک بیوی کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر بے حد بھروسہ کرتے تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کی بات بات پر جا اور بے جا نکتہ چینی کرتی ہیں۔ مگر اس کا یہ قاعدہ نہ تھا۔ اوّل تو عابد حسین سویرے ہی لوٹ آتے تھے اگر کسی دن دیر بھی ہوگئی تو یہ انہیں سوال کر کر کے عاجز نہ کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کا کام چلانے میں اُنہوں نے ہر طرح تعاون کیا۔ اُن کے زیور اور سامان بک کر بہت دنوں تک گھر کا خرچ چلتا رہا۔ پھر بہت دنوں اُن کی محنت کام آئی۔ وہ ٹوپیاں بنا کر بکواتی رہیں۔

رات کو عابد حسین گھر میں نقشہ بنانے اور حرف لکھنے کی مشق کرتے رہے۔ اگلے دن صبح کو بلدیہ مستری کے کارخانے پہنچے اور وہیں سے دفتر پہنچ کر ٹریسنگ کی مشق کرنے لگے۔ پانچ چھ دن میں کام آگیا۔ نبی بخش نے صاحب سے کہہ کر نام لکھا دیا اور یہ بیس روپے مہینہ کے نوکر ہوگئے۔ مادھو کو پڑھانا اب بھی جاری رکھا۔ بڑی محنت پڑتی تھی۔ اکثر ایک ہی وقت کھانا ملتا تھا مگر پچیس روپے مہینہ کا سہارا ہوگیا تھا۔ اُدھر بیوی نے ٹوپیاں تیار کرنے کا کام جاری رکھا۔ اس طرح گذر بسر کی اچھی خاصی صورت ہوگئی تھی۔

عابد حسین کے حوصلے بلند تھے۔ ان کی جگہ کوئی پست ہمت ہوتا تو اسی کو بہت سمجھ کے زندگی گزار دیتا مگر انہیں تو ترقی کرنے کی دھن سوار تھی۔ ٹریسنگ سیکھ چکے تو نقشہ نویسی سیکھنے لگے۔ شام کو نبی بخش کے گھر پہنچ جاتے اور دیر تک مشق کرتے رہتے۔ ساتھ ہی انہیں انگریزی بھی پڑھاتے۔ چھ سات مہینے میں یہ ایک ماہر نقشہ نویس اور اسٹیمیٹر بھی ہوگئے۔ کچھ دن بعد منشی نبی بخش کو چھٹی کی ضرورت پڑی تو انہوں نے عوضی میں کام کیا۔ صاحب اُن کے کام سے بہت خوش ہوئے۔ مگر ابھی اُن میں ایک بات کی کسر تھی۔ پیمایش کا کام یہ بالکل

نہیں جانتے تھے۔ اب انہوں نے تہیہ کیا کہ یہ کام بھی سیکھ کے ہی رہیں گے۔

ادھر یہ ہوا کہ منشی نبی بخش چھٹی سے لوٹ آئے اور انہیں پھر ٹریسر کی پرانی جگہ پر واپس جانا پڑا۔ اب ٹریسروں کی ضرورت نہ رہی تھی اس لیے ان کی ملازمت بھی جاتی رہی اور وہی پانچ روپے مہینہ کی آمدنی باقی رہ گئی۔ انہوں نے منشی نبی بخش کی جگہ بڑی محنت سے کام کیا تھا اس لیے صاحب نے بہت اچھا سرٹیفکیٹ دیا۔ خیر اب انہوں نے سروے کا کام سیکھا اور ایک اوورسیر اللہ بخش کے شاگرد ہو گئے۔

کچھ دن بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو عابد حسین کی ترقی کا سبب بنا۔ ایک دن اُن کے ایک پڑوسی میر کاظم علی پنجاب یونیورسٹی کے قواعد لے کر آئے۔ وہ کسی امتحان میں شریک ہو رہے تھے۔ انہوں نے وہ کتاب دیکھی تو اندازہ ہوا کہ وہ انجینیرنگ کے امتحان میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اُن دنوں اُن کے ایک اور دوست سید جعفر حسین صاحب آئے ہوئے تھے۔ یہ رُڑکی کے سند یافتہ تھے اور نہر کے محکمہ میں انجینیر تھے۔ اُن سے مشورہ کیا اور رجسٹرار کو درخواست بھیج دی۔

امتحان کی تیاری میں بلدیو کے کارخانے سے بہت مدد ملی۔ لوہے کا کام یہ پہلے ہی سیکھنے لگے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک دن عابد حسین کی بیوی کے سروتے کی کیل ٹوٹ گئی۔ یہ سروتا لے گئے اور مرمت کے لیے ہلاس کو دے دیا۔ وہ بھول گیا۔ ایک دن انہوں نے خود ہی کیل ٹھونکنی چاہی تو ان کی انگلی میں چوٹ لگ گئی۔ اس پر ہلاس بہت ہنسا اور بولا "میاں یہ لکھنا پڑھنا نہیں لوہے کا کام ہے" یہ بات انہیں بری لگی اور اسی دن طے کر لیا کہ یہ کام بھی سیکھ کے رہیں گے۔ گھر پر بھٹی بنائی، دھونکنی خریدی اور نیلام سے اوزار اور کاٹ کباڑ خرید کے مشق کرنے لگے۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی مشینیں خریدیں۔ ان میں ایک برف جمانے کی تھی، دوسری کپڑے سینے کی۔ ان کی مرمت کی۔ جو پرزے ٹوٹے ہوئے تھے وہ ڈھال کے لگائے۔ برف کی مشین تو نخاس میں دس روپے کو بک گئی۔ کپڑے سینے کی مشین بیوی کے کام آئی۔ اس سے انہوں نے

سلائی کا کام شروع کر دیا۔

اس کے بعد اُنہوں نے لکڑی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ یہ کام آسان تھا اسے بھی کچھ ہی دنوں میں سیکھ گئے۔ چوکیاں، الماریاں اور تپائیاں بنا کے بیچنی شروع کر دیں۔ اللہ نے محنت کے کاموں میں اتنی برکت دی کہ انجنیری کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی درگاہ والا مکان چھڑا لیا۔ یہ مکان کنجڑے کے پاس رہن تھا۔ اب اسی کو کرایے پر دے دیا اور جس مکان میں کرایے پر رہتے تھے اسے خرید لیا۔ گھر میں برتن باسن نہ تھے۔ اب وہ بھی ہو گئے۔ بیوی کا زیور بک گیا تھا۔ وہ دوبارہ بن گیا۔ اور بنا خود اُن کی محنت سے۔ اُنہوں نے سلائی کر کر کے روپے جمع کیے اور زیور بنوا لیا۔

عابد حسین محنت کے ایسے عادی تھے کہ جس کام کو کرتے بس اس کا حق ادا کر دیتے۔ اس لیے قدم قدم پر انہیں کامیابی نصیب ہوتی اور اس کامیابی سے اُن کی ہمت اور بھی بڑھ جاتی۔ یہ بھی اُن کی محنت ہی کا پھل تھا کہ پنجاب یونیورسٹی سے انجینرنگ کا امتحان پاس کیا تو وہ بھی اول درجے میں۔ دو تین مہینے میں نوکر بھی ہو گئے۔ ساٹھ روپے تنخواہ، پندرہ روپے بھتہ۔ پچھتر روپے مہینہ کی آمدنی ہو گئی۔ یہاں رشوت اور بے ایمانی سے خوب کمایا جا سکتا تھا مگر ہمارے دوست نے کبھی ناجائز پیسے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پیسہ کمانے کی انہیں دھن ضرور تھی۔ دن رات محنت کرتے تھے مگر انہوں نے جو کچھ کمایا اپنی محنت سے۔

عابد حسین اپنے ہاتھ سے سارا کام کر لیتے تھے۔ اُن کی اِس خوبی نے ان کی ترقی میں بہت مدد کی۔ ایک دفعہ اُن کے بڑے افسر یعنی اگزیکیٹو انجینیر صاحب کو ایک پُل کے نمونے کے سانچے کی ضرورت پڑی۔ انہیں دورے پر جانے کی جلدی تھی اور بڑھئی کی سمجھ میں نقشہ نہ آیا۔ عابد حسین نے اپنے ہاتھ سے سانچہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ صاحب معائنے کے لیے کارخانے میں آئے۔ دیکھا کہ بڑھئی مستری سب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں اور اوورسیر صاحب ہاتھ میں بسولا لیے کام کر رہے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اُس دن انہیں پتہ چلا کہ وہ ہاتھ سے

بھی کام کر سکتے ہیں۔ جب صاحب دوسری جگہ جانے لگے تو انہوں نے سروس بُک میں لکھا کہ "عابد حسین اپنا کام خوب جانتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بڑھئی اور لوہار کا کام بھی کر سکتا ہے ہم اس کی ترقی کی سفارش کرتے ہیں۔" اس رپورٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہی سال میں وہ سب انجینیر ہو گئے۔

ترقی کے بعد انہیں افغانستان کی سرحد پر جانا پڑا۔ یہاں ایک بار انہیں بہادری دکھانے کا موقع بھی ملا۔ ہوا یوں کہ ایک دن یہ صاحب کے ساتھ پہاڑ کے درّے میں پیمایش کو گئے۔ وہاں چھ سات پٹھانوں نے آکر گھیر لیا۔ خلاصی یہ دیکھ کر رفوچکر ہو گئے۔ عابد حسین اور صاحب اکیلے رہ گئے۔ صاحب نے جان کا خطرہ دیکھا تو کمر سے پستول نکال لیا۔ مگر اتفاق سے گولی نہ چلی۔ اس پر وہ اور بھی شیر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر عابد حسین نے تلوار نکال لی اور بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ان کے مرحوم والد سپاہ گری کے فن میں طاق تھے۔ انہوں نے بیٹے کو بھی تلوار کے ہاتھ سکھا دیے تھے۔ آج وہی کام آئے۔ اس کے بعد صاحب کے دل میں ان کی اور بھی قدر ہو گئی۔

کچھ محکموں میں رشوت کا بڑا زور ہوتا ہے۔ اگر وہاں کوئی ایماندار افسر آجائے تو سب کی آمدنی میں خلل پڑتا ہے۔ اس لیے سارے رشوت خور اُس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی شکلیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جن دنوں عابد حسین نہر کے محکمے میں ملازم تھے، ایک رشوت خور ہیڈ کلرک اُن کا دشمن ہو گیا۔ دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ پُلوں کی مرمّت کا ٹھیکہ درگا ٹھیکیدار کے پاس تھا۔ وہ دس روپے سیکڑہ بچھلے اوورسیر صاحب کو دیتا تھا۔ اس میں سے ہیڈ کلرک کو بھی اس کا حصہ ملتا تھا۔ اب عابد حسین وہاں پہنچے تو یہ رشوت کا کاروبار بند ہوا۔ پہلے جھوٹی پیمایش ہوتی تھی۔ اب ایک ایک انچ کی صحیح پیمایش ہونے لگی۔ ہیڈ کلرک نے انہیں اپنے راستے پر چلانے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے تو یہ سبق پڑھا ہی نہ تھا۔ آخر بگاڑ ہوا۔ ہیڈ کلرک نے جھوٹی شکایتیں اوپر پہنچائیں اور صاحب کی رائے اُن کے

بارے میں خراب کردی۔

ایک موقع پاکر ہیڈ کلرک نے مرزا صاحب کے خلاف ایک مصیبت کھڑی کردی۔ ایک بار عابد حسین نے پانچ میل کا لیول نکالا اور فیلڈ بک دفتر میں جمع کردی۔ اس بدبخت نے پنسل کے حرفوں کو مٹا کے غلط نمبر لکھ دیے۔ سارا حساب غلط ہوگیا۔ یہ بڑے پریشان ہوئے غور کیا تو مٹانے کے نشان دکھائی دیے۔ صاحب کو دکھایا مگر وہ ہیڈ کلرک پر بہت مہربان تھے اس لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس طرح بات نہ بنی تو رشوت کا ایک مقدمہ کھڑا کر دیا۔ ایک ٹھیکیدار سے صاحب کے سامنے بیان دلوادیا کہ مرزا صاحب نے رشوت لی ہے۔ گواہ بھی پیش ہوگئے۔ سب کو یقین آگیا کہ بات درست ہے۔

مرزا کا کہنا تھا کہ جس وقت رشوت لینے کا الزام ہے اس وقت وہ پچاس میل دور انجینیر صاحب کے ساتھ پیمایش کر رہے تھے۔ انجینیر صاحب کو بھی طلب کیا گیا تھا مگر ہیڈ کلرک صاحب تو جعل سازی کے ماہر تھے۔ انہوں نے اس کا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔ دورے کی کتاب میں تاریخ بدل دی گئی تھی۔ صاحب کو صحیح تاریخ زبانی یاد تھی مگر نوٹ بک کی تحریر کے خلاف زبانی بات کیا معنی رکھتی تھی۔ اخبار والے اور سب لوگ مرزا کو بے قصور سمجھتے تھے مگر مرزا پھنسے بُری طرح تھے۔ جیل جانے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ مقدمے کی آخری تاریخ میں چار دن باقی تھے۔ مرزا پر یہ وقت بہت ہی سخت گزر رہا تھا۔ رشوت کھانے والا عملہ خوش تھا کہ مرزا نے اُن کی آمدنی بند کر دی تھی۔ اب یہ راستے کا پتھر ہٹنے والا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ خود صاحب کو مرزا کے جیل جانے کا کچھ ملال نہ تھا۔ ایک واقعہ ایسا پیش آگیا تھا کہ وہ مرزا سے خوش نہ رہے تھے۔

صاحب کے مرزا سے خوش نہ رہنے کی وجہ ہم مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ صاحب ایک بار لیول کر رہے تھے۔ مرزا قدموں سے پیمایش کرکے کھونٹیوں پر گز رکھواتے جاتے تھے۔ خلاصی جو ساتھ کام کر رہا تھا وہ پیمایش کے کام سے واقف نہ تھا۔ اس نے ایک گز کو کھونٹی

کے بجائے زمین پر پڑھوا دیا۔ ذرا آگے چل کر مرزا صاحب کو اس غلطی کا پتہ چلا۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ ساری پیمائش غلط ہو جائے گی صاحب کو بتا دیا۔ انہیں اس بات پر بڑا غصہ آیا اور مرزا کو سخت سست کہنے لگے۔ ذرا سی چوک مرزا سے بھی ہوئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گئے۔

آگے چل کر صاحب نے حکم دیا کہ سہ حدّے پر گز رکھو۔ مرزا صاحب اس علاقے میں پہلی بار آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں سے پوچھا کہ سہ حدّہ کہاں ہے اس میں ذرا دیر ہو گئی۔ صاحب کو ڈیرے پر لوٹنے کی جلدی تھی اور یہاں دیر ہوتی جا رہی تھی اس لیے وہ جھنجھلائے اور مرزا کو الو کہہ بیٹھے۔ مرزا بھی کب چوکنے والے تھے انہوں نے بھی برابر کا جواب دیا۔ صاحب کو ایسی بات سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ مرزا کوئی کام بہت اچھا کرتے تو صاحب کہتے کہ یہ تو ڈیوٹی ہے۔ کوئی کام کبھی خراب ہو جاتا جیسا کہ ہر آدمی سے کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے تو صاحب فوراً فائل میں نوٹ لکھ دیتے۔ ایسی قانونی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ افسر ماتحت میں کچھ ہمدردی ضرور ہونی چاہیے۔ ہمدردی دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ماتحت محنتی اور ایماندار ہو اور افسر اس کے کام کی قدر کرنے والا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے اور اکثر یہی ہوتی ہے کہ ماتحت خوشامدی اور چاپلوس ہو اور افسر خوشامد پسند۔ نہ مرزا صاحب خوشامدی تھے اور نہ صاحب خوشامد پسند بلکہ وہ اچھے کام کی قدر کرتے تھے مگر ہیڈ کلرک نے ایسی کارستانی دکھائی کہ اصلیت چھپ گئی۔ مرزا بھی اکھڑ آدمی تھے اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کوئی خوش ہے یا ناخوش اس کی پروا نہ کرتے تھے۔ پچھلے افسروں کی تعریف سے ان کی فائل بھری پڑی تھی مگر نئے صاحب نے ان کا کھاتہ بند کرا دیا تھا۔

3

مرزا کی قسمت کے فیصلے میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ ٹھیکیدار شیو بہاری اور ٹھیکیدار رام دین ایک شراب خانے میں بیٹھے ٹھرا اڑا رہے ہیں۔ شیو بہاری وہی ٹھیکیدار ہے جس سے یہ بیان دلایا گیا ہے کہ اس نے مرزا کو رشوت دی۔ دونوں میں باتیں ہو رہی ہیں۔

رام دین: کیوں جی، اس مقدمے کا کیا رہا؟

شیو بہاری: کون سا مقدمہ؟ اچھا وہ مرزا والا؟

رام دین: ہاں ہاں وہی۔

شیو بہاری: ہوا کیا۔ یہ سمجھ لو کہ مرزا گئے سات برس کو۔

رام دین: بڑے پُن کا کام کیا تم نے؟

شیو بہاری: تو باپ کون سا ہوگیا۔ ایسے آدمی کا جیل میں سڑنا ہی اچھا ہے جو نہ خود کھائے نہ دوسرے کو کھانے دے۔ باپ قسم بھیّا رام دین، جب سے یہ مرزا اس علاقے میں آیا۔ میرا تو دس بارہ ہزار کا گھاٹا ہوگیا۔

رام دین: کیوں کیا تمہارا کوئی بل کاٹ دیا؟

شیو بہاری: بل تو نہیں کاٹ دیا مگر بابو کی صفائی میں ہمیں ہر سال ہزار ڈیڑھ ہزار روپے بل جایا کرتے تھے۔ اب چار برس سے ایک کوڑی بھی نہیں ہاتھ آئی۔

رام دین: کیوں۔ کیا ٹھیکہ توڑ دیا؟

شیو بہاری: یہ تو نہیں کیا مگر پیمائش میں کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ دو سو چھبیس سات آنہ وصول ہے۔ کہو جب اس کام میں دو سو پچھتر سال میں ملے تو ہم کیا کھائیں گے؟

رام دین: پیمائش کم بٹھادی ہوگی۔

شیو بہاری: یہ کون کہتا ہے کہ پیمائش کم بٹھادی۔ تم ساری بات سمجھتے ہو اور پھر نادان بنتے ہو

رام دین: پھر شکایت کس بات کی جتنا کام تم نے کیا اتنے دام مل گئے۔ اتنی بات تو ہم بھی کہیں گے کہ مرزا ہیں پیمائش کے سچے۔ ہم نے تو ایک کام کر کے دیکھ لیا۔ نہ ایک انچ گھٹایا نہ بڑھایا۔ پورے پورے دام دلوائے۔ نہ ہمارا نقصان کیا نہ سرکار کا۔ ہیڈ کلرک صاحب پانچ روپے مانگتے تھے مگر میں نے کچھ نہ دیا۔ پوری ایک ایک پائی وصول کر لی۔ کام میرا۔ محنت میری۔ روپیہ میں نے لگایا۔ پھر ہیڈ کلرک کو پانچ روپے کس بات کے دیتا؟

شیو بہاری: بل کتنے کا بنا تھا؟

رام دین: پانچ ہزار چھ سو اکانوے روپے تیرہ آنے سات پائی کا۔

شیو بہاری: اس میں سے اوورسیر صاحب کو کیا دیا؟

رام دین: مرزا کو؟

شیو بہاری: ہاں ہاں اور کسے؟

رام دین: اس بات کی تو میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مرزا نے کبھی ایک پیسہ گھوس کا نہیں کھایا۔ تم نے اسے غلط پھنسایا ہے۔ دیکھنا اس کا کیا بھگتان بھگتتے ہو۔ پھر عدالت میں گنگا جلی جھوٹی اٹھائی۔ مرزا دیوتا آدمی ہے۔ اس کو دُکھ دے کے پھل نہ پاؤ گے۔ (اتنا کہہ کے رام دین رونے لگا)

شیو بہاری: تم روتے ہو۔ مرزا تو اب جیل گئے۔ جو ہمارا نقصان کرے ہم اس کے باپ کو پھنسائیں گے۔

رام دین: ارے جا۔ تو نے دھرم کا ناس کیا۔ ایسے گؤ آدمی کو پھنسایا۔ پرمیشر نے چاہا تو اس زیادتی کی سزا تجھے یہیں ملے گی۔ اور اگلے جنم میں جو بھگتان بھگتنا پڑے گا اسے تو کون جانے۔

شیو بہاری: اور جو کسی کا پیٹ کاٹے گا تو اس کا کیا ہو گا؟

رام دین: تیرا پیٹ کب کاٹا۔ جتنا کام کیا اتنا پیسہ مل گیا۔

شیو بہاری: اور آپ جو رشوت کھائی؟

رام دین: تو جھوٹا ہے۔ مرزا نے ایک دمڑی رشوت نہیں کھائی۔ تو کہتا ہے 7 مئی کو رشوت دی۔ اس دن تو وہ صاحب کے ساتھ دورے پر تھے۔ تو نے اس دن برہام پور کے پڑاؤ پر روپے کیسے دے دیے۔

شیو بہاری: میں کوئی جھوٹ کہتا ہوں۔

رام دین: ہاں سب جھوٹ ہے۔ اس دن چار بجے صاحب نے سیتا نارے کا پل دیکھا تو مرزا بھی صاحب کے ساتھ تھے۔ وہیں میں بھی تھا۔ میرے چٹھے میں صاحب کا ملاحظہ لکھا ہوا ہے۔ وہاں سے چار میل آگے صاحب نے شیو دین کھیڑہ میں قیام کیا۔ دوسرے دن صبح سے شام تک صاحب کے ساتھ پیمائش میں رہے۔ وہاں سے برہام پور 34 میل دور ہے۔ اتنی دور تجھ سے رشوت لینے کس وقت پہنچ گئے۔

شیو بہاری: 7 مئی کو صاحب دورے پر گئے ہی نہیں۔ اُن کی نوٹ بک میں 7 مئی کا دورہ لکھا ہے۔ تو 7 مئی کا دورہ بک رہا ہے۔

رام دین: سات کے سترہ بنا دیے گئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ہمارا چٹھا دیکھ لے۔

شیو بہاری: ابے تیرے چٹھے کو پوچھتا کون ہے۔ کہاں صاحب کی نوٹ بک کہاں تیرا چٹھا۔

رام دین: نوٹ بک میں تو گڑبڑ ہو گئی۔ ہمارے چٹھے میں گڑبڑ کون کرتا۔

شیو بہاری: پھر تو نے گواہی دی ہوتی۔

رام دین: ہاں ہم کانپور گئے ہوئے تھے۔ نہیں تو ضرور گواہی دیتے۔ اور اب وقت آیا تو ضرور دیں گے۔
یہ بات سن کے شیو بہاری کا نشہ ذرا کم ہوا اور وہ نرمی سے بات کرنے لگا کیونکہ ابھی فیصلے میں تین دن باقی تھے اور ابھی عذر کیا جا سکتا تھا۔ ککّی چمار مرزا کے سائیس کا بھائی تھا۔ ٹکے کا ٹھرّا اُڑانے وہ بھی ادھر آیا کرتا تھا۔ اس دن وہ بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے مقدمے کی بات سنی تو ٹھرّا پی کے نیم کی آڑ میں چلم کے کش لینے لگا۔ اس نے ساری باتیں سُن لیں اور گھر پہنچ کر سارا واقعہ مکا کو سنایا۔ اس نے اگلے دن سارا حال مرزا کو بتایا۔

رام دین مع چپڑے کے طلب ہوگیا۔ مرزا کے حق میں یہی ثبوت کافی تھا۔ یہ قصہ اخبار میں بھی چھپا۔ تو سپرنٹنڈنٹ انجینیر کو بھی اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہیں یاد آیا کہ سیتا نالے کے معائنے کے سلسلے میں ایگزیکٹیو انجینیر نے ایک چٹھی لکھی تھی۔ وہ نکال کے دیکھی تو اس میں ازمقام شیو دین کھیڑہ تحریر تھا اور 7 رمئی تاریخ لکھی تھی۔ بڑے صاحب نے اسی وقت انجینیر صاحب کو خط لکھا اور سشن جج کو بھی اطلاع دی۔ اب مقدمے کی صورت بدل گئی۔ مرزا عزت کے ساتھ بری ہوئے۔ شیو بہاری پر الٹا مقدمہ چلا۔ بچا سات برس کو گئے۔ ہیڈ کلرک کا تبادلہ ہوگیا۔ صاحب کا بھی تبادلہ ہوگیا۔ نئے صاحب آئے تو ان سے مرزا صاحب کی خوب نبھی۔ انہوں نے سپروائزر کے عہدے تک ترقی پائی۔

4

کسی فلسفی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ آدمی کی ترقی کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ذاتی صلاحیت ہو۔ دوسرے یہ کہ اُسے ایسا ماحول میسر آجائے جو اس کی ترقی میں مدد دے۔ مرزا کی صورت یہ تھی کہ ان کے والد نے انہیں تعلیم دلانے کی کوشش کی۔ وہ خود بھی فارسی پڑھے ہوئے تھے لیکن ان کے بزرگوں میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ مرزا صاحب ہمیں معاف کریں ان کے سارے بزرگ اکثر اَن پڑھ تھے اور سپاہی پیشہ تھے۔ پاس پڑوس کا یہ حال تھا کہ قریب میں بس کہاروں کے گھر تھے۔ جن کے لڑکوں میں دُرگا پڑھ کے سرفراز محل کی ڈیوڑھی پر کہاروں کا مہرا بن گیا۔

دیبی بنیا بھی پاس ہی رہتا تھا۔ اس کا لڑکا مہکو لال سعادت گنج میں آڑھتیا ہو گیا۔ مرزا کے ایک بچپن کے ساتھی فدا علی تھے۔ انہوں نے پڑھ کے کبوتر پالے۔ سو کبوتروں کی ٹکڑی اُڑا کے نواز گنج تک بھیجی۔ اور قربان علی جو اس فن میں استاد تھے ان کے پندرہ کبوتر مار لیے۔ یہ انجینیر ہوئے تو وہ شہنشاہ مرزا کی سرکار میں کبوتر باز ہو گئے۔ جب یہ پنشن لے کر گھر آئے ہیں تو میاں فدا علی نے اس وقت نوکری چھوڑ دی تھی اور کبوتر، بٹیریں، تیتر، بلبلیں مول لے کے مٹیا برج بھیجا کرتے تھے۔ محلے میں ایک نواب صاحب بھی رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے چانڈو بنانے میں ماہر ہوئے۔ بالشت بھر چھینٹا لٹکتا ہوا انہیں کے قوام میں دیکھا۔

عزیزوں میں ایک لڑکا چھٹن تھا۔ اس نے بٹیر کی چونچ ایسی بنائی کہ شہر بھر میں شہرت ہو گئی۔ ایک اور ہمجولی علی حسین تھا۔ اسے ورزش کا شوق تھا۔ بڑا ہو کے بے بدل بانکا ہوا۔ بڑے بڑے بدمعاش اس سے ڈرتے تھے۔ سعادت گنج سے نخاس تک اور وہاں سے امین آباد تک اس کی دھاک تھی۔ حضرت عباس کا عَلم ایسا اٹھایا کہ اتنا اونچا عَلم اس سے پہلے شہر میں

نہ اٹھا۔ پھر اس طرح کہ ڈولچی باندھی نہ ڈوریاں لگائیں۔ مرزا باقر حسین کے دوستوں میں ایک مرزا حیدر حسین تھے۔ ان کو شاعری کا خبط تھا۔ حسرت تخلص کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے تصدق حسین صاحب مرزا کے ہم جماعت تھے۔ پڑھے لکھے تو خاص نہ تھے مگر تیرہ چودہ برس کی عمر میں شعر کہتے تھے۔ وحشت تخلص تھا۔ ایک مشاعرے میں غزل پڑھی۔ اس میں ایک شعر ایسا تھا کہ بہت پسند کیا گیا اور بار بار پڑھوایا گیا بلکہ لوگ اس شعر کو پڑھتے ہوئے گھر گئے۔ وہ شعر یہ تھا، ۔

جنونِ قیس کا انداز جو تھا اسے زندہ کیا وحشت ہمیں نے

یوں تو اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں مگر ایک تو تخلص نے لطف بڑھا دیا۔ دوسرے کم عمر بچّے کی زبان سے سنا تو اور بھی لطف آیا۔

عابد حسین کو شعر سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا مگر یہ بات بھی نہیں کہ سمجھتے نہ ہوں۔ والد صاحب نے بڑی محنت سے فارسی پڑھائی تھی۔ میاں وحشت نے مشاعرے کے اگلے دن وہ شعر بڑے فخر کے ساتھ مرزا کے سامنے پڑھا۔ انہوں نے کہا اس کا مطلب بس یہ ہوا کہ قیس کو جیسا جنون تھا ویسا ہی ہم کو بھی ہوا۔ اس بات میں کوئی خاص لطف نہ ہوا۔

شعر کہنا، چائے کی پیالیوں پر پیالیاں پینا، حقہ پینا، داستان کہنا یا سننا یا پھر ان سب سے بڑھ کر مقدمے لڑانا یہ سب عام شوق ہوتے تھے مگر مرزا کو ان میں سے کسی سے بھی دل چسپی نہ تھی۔ اپنے فارم کو انہوں نے اپنی دل چسپی کے مطابق تیار کیا تھا۔ اس فارم میں رہنے کا مکان تھا۔ زنانہ مکان سے ملا ہوا ایک اور چھوٹا سا مکان تھا۔ یہ ان کی لیبارٹری (تجربہ گاہ) تھی۔ اس میں طرح طرح کے آلے لگے ہوئے تھے۔ یہاں فزکس اور کیمسٹری سے متعلق تجربے کیے جا سکتے تھے۔ نباتات کے نمونے جمع کرنے کے لیے کئی بیگھہ زمین الگ کر دی گئی تھی۔ اس سے ملا ہوا گرین ہاؤس تھا جس میں طرح طرح کے خوشنما پیڑ پودے لگے تھے۔ بیچوں بیچ ایک حوض تھا جس کے چاروں طرف پہاڑوں کے نمونے بنائے

گئے تھے لیبارٹری کے نزدیک ہی ایک آبزرویٹری تھی۔ یہاں موسم کا مطالعہ کرنے کے لیے آلات لگے ہوئے تھے۔ ایک ماڈل ہاؤس تھا جس میں طرح طرح کی کلوں کے نمونے جمع کیے گئے تھے اس سے ملا ہوا اصطبل تھا۔ پھر ملازموں کے مکان تھے۔ کھیتی کا کل کام مرزا عابد حسین خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ نوکر بھی اس طرح کے رکھے تھے جنھیں کسی کام کے کرنے میں عار نہ ہوتی تھی۔

مرزا نے جو ملازم رکھے تھے وہ اصل میں ملازم نہ تھے۔ بلکہ ایک طرح مرزا کے کام میں برابر کے شریک تھے۔ جتنی پیداوار ہوتی وہ سب میں برابر تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہر آدمی جی توڑ کے کام کرتا تھا اور اللہ نے برکت بھی ایسی ہی دی تھی۔ مرزا کی فرصت کا سارا وقت تجربہ گاہ میں گزرتا تھا۔ جو تجربے کیے جاتے انہیں الگ الگ رجسٹروں میں درج کیا جاتا تھا۔ گھر کے کاموں سے مرزا سروکار نہ رکھتے تھے۔ یہ سب ان کی بیوی کے سپرد تھا۔

ملازمت کے زمانے میں مرزا پر ایک بری مصیبت پڑی تھی۔ وہ ہمیشہ نیک نام رہے پہلے پہل سب اوورسیر ہوئے تھے۔ اس کی تنخواہ پچیس روپے ہوئی تھی اور بھتہ سات روپے گھوڑے پر بھتے کے روپے سے کچھ زیادہ ہی صرف ہوتا تھا۔ اب بچی تنخواہ تو وہ ایک کنبے کو مشکل سے ہی پوری ہو سکتی ہے مگر یہ بڑے چلن سے چلے۔ بیوی نے بھی بڑی کفایت شعاری سے کام لیا۔ اس لیے خرچ کی طرف سے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

مرزا تیسرے درجے کے سب اوورسیر مقرر ہوئے تھے۔ وہاں سے ترقی کرتے کرتے وہ اسسٹنٹ انجینیر کے عہدے تک پہنچے۔ یہ ترقی مرزا کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے تو کچھ بھی نہ تھی۔ مگر حالات کے مطابق اس سے زیادہ ترقی ممکن نہ تھی۔ ترقی میں صرف لیاقت کام نہیں آتی۔ افسر کی خوشی اور ناخوشی بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ سرکاری نوکری میں تبادلے بڑی جلدی جلدی ہوتے ہیں۔ اس لیے افسر اپنے ماتحت کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں پاتا۔ نتیجہ یہ

ہے کہ جو ترقی کا مستحق نہیں ہوتا اسے اکثر ترقی مل جاتی ہے۔ اور جسے ترقی ملنی چاہیے وہ کبھی کبھی محروم رہ جاتا ہے۔ افسر یا ماتحت ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں۔ مثلاً افسر تو شہر سے باہر کسی خوبصورت بنگلے میں رہتا ہے اور ماتحت شہر کی کسی گندی تاریک گلی میں۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر مرزا کے افسران کی طبیعت سے واقف ہوتے تو ان پر جھوٹا مقدمہ قایم نہ ہوتا۔ یہ افسر ہر ماتحت کو چور، بے ایمان اور رشوت خور سمجھتے ہیں۔ اور کتنے افسر ایسے ہوتے ہیں جو خود رشوت میں حصّے دار ہوتے ہیں۔

مرزا کہا کرتے تھے کہ دنیا ایمان داروں سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے تھے جس زمانے میں میں ضلع سہارنپور میں اوورسیر تھا۔ میری اردلی میں ایک سیّد مسلمان محسن علی چپراسی تھا۔ اسے میں نے اتنی احتیاط برتتے دیکھا کہ اتنی کم تنخواہ والوں میں ممکن نہیں۔ افسروں کے ساتھ جو چپراسی دوروں پر جاتے ہیں ان کا طریقہ یہ دیکھا کہ آٹا، دال، گھی، گڑ، لکڑی تیل اور مٹی کے برتن سیدھے سادے غریب دیہاتیوں سے وصول کرتے ہیں اور اس کے لیے طرح طرح کی دھمکیاں اور دھوکے دیتے ہیں۔ کچھ افسر بھی اسی مزاج کے ہوتے ہیں مگر خدا رحمت کرے محسن علی پر کہ لکڑیاں تک مول لے کر جلاتا تھا۔ پانچ روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ وہ کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ اٹھاتا تھا۔ لیکن ایسی مثالیں تو گنتی کی ہیں۔ دفتروں اور محکموں میں کتنے ہی خدا کے بندے ایسے ہیں جو حرام اور حلال میں فرق نہیں کرتے۔

مرزا جب پنشن لے کر لکھنؤ آئے تو قریب میں کچھ گاؤں خریدے۔ لکھنؤ میں ایک نزولی زمین خریدی۔ ایسی زمین پر روزہ نماز جائز نہیں۔ اس لیے فکر ہوئی کہ اس کے اصل مالک سے اجازت لیں۔ پتہ چلا کہ اس کی وارث ایک کم عمر بچی ہے۔ اس کا ولی یا سرپرست بھی کوئی نہیں۔ آخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ اپنے بیٹے احمد علی سے اس کی شادی کرلیں۔ آخر یہی ہوا۔ بڑے بڑے رئیس چاہتے تھے کہ احمد علی ان کا داماد بن جائے۔ خود مرزا کے خاندان میں اچھی اچھی لڑکیاں موجود تھیں مگر ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ مرزا کی بیوی

اس رشتے کو پسند نہ کرتی تھیں مگر جب مرزا نے بات سمجھائی تو وہ بھی راضی ہو گئیں۔

مرزا اور ان کی بیوی میں ایسا میل محبت تھا جیسا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ بیوی کا گھونگھٹ کھلا اور میاں سے مورچہ جم گیا، ساس سے جھگڑا شروع ہو گیا، نندوں سے تو تو میں میں اور جوتی پیزار ہونے لگی۔ کبھی منہ پھولا ہے، کبھی ناک چڑھی ہے۔ کوس رہی ہیں، گالیاں دینے پر آئیں تو سات پشتوں کو نہ چھوڑا۔ میاں بیوی کے تعلقات میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ ہو۔ یہ نہ ہو تو گھر کا کارخانہ کبھی چل سکتا ہی نہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ میاں نے کوئی بات کہی اور بیوی نے کہا "چل جھوٹے" یا بہت تمیز کی بات کی تو بولیں "اچھا یوں ہی ہو گا۔ پھر ہمیں کیا"۔

میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے سچ بولتے ہوں، سچا سمجھتے ہوں تو اس سے خدا بھی راضی ہوتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا "اے امیر المومنین! کفر کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا "خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرنا اور انسانوں کو تکلیف پہنچانا" واقعی کتنی صحیح تعریف کی ہے جسے خدا کا ڈر ہے وہ انسانوں کو تکلیف پہنچانے سے ڈرتا ہے۔ اور میاں بیوی کو تو بالکل ایک ہونا چاہیے۔ بہت سی خرابیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ دونوں اپنے فرض کو نہیں سمجھتے۔

نئی روشنی کے لوگوں میں سے کسی نے کہا ہے کہ میاں بیوی دونوں کو خود مختار ہونا چاہیے۔ دونوں کا مال بھی الگ الگ ہو۔ اگر میاں کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں تو بیوی کسی دفتر میں ملازم ہے۔ میاں پچاس روپے مہینہ کماتے ہیں تو بیوی سو روپے مہینہ۔ دونوں اپنا کھاتے ہیں، اپنا پہنتے ہیں۔ نہ یہ آپ کے محتاج ہیں نہ وہ آپ کی۔ ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے اس لیے فرصت کا وقت ساتھ گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کو موجود رہتے ہیں مگر اس کے علاوہ اور کچھ تعلق نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس طریقے کو اپنانے سے گھر نہیں بن سکتا۔

فرض کرو میاں گھڑی سازی کی دکان کرتے ہیں اور رات کو ۸ بجے دکان بند کرکے گھر لوٹتے ہیں۔ بیوی ساڑھے پانچ بجے دفتر سے تشریف لاتی ہیں۔ گھر کا سارا کام نوکروں پہ ہے۔ (بشرطیکہ نوکر رکھنے کی حیثیت ہو) نوکروں نے کھانا پکار کھا۔ بچھونے لگا دیے۔ میاں بیوی دونوں کھا پی کے سو رہے۔ صبح کو پھر اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔ ایسی زندگی کچھ دنوں تک تو گزاری جا سکتی ہے مگر ہمیشہ نہیں۔ فرض کرو ایک بیمار پڑ گیا۔ اب اگر دوسرا اس کی خدمت اور دیکھ بھال کرنا چاہے تو چھٹی لے کر جو مشکل ہے۔ یا پھر سرکار کی طرف سے ایسا بندوبست ہو کہ بیماروں کے لیے ہسپتال ہوں۔ وہاں اُن کی دیکھ بھال ہو۔ اس میں بھی یہ ہے کہ جو صحت مند ہے وہ اپنے کام پر جائے اور بیمار کے لیے بس کُڑھ کے رہ جائے۔

اگر میاں بیمار ہوئے تو چاہنے والی بیوی صرف دل میں افسوس کر سکتی ہے۔ میاں کی تیمار داری اُن لوگوں کے حوالے ہے جو ہسپتال سے معمولی تنخواہ پاتے ہیں۔ ایک تو میاں بیمار ہوئے۔ پھر بیوی سے چھوٹے۔ خدا ہی اُن کی جان کا حافظ ہے۔ اگر انتقال ہو گیا تو بیوی کو یہ فکر ہوئی کہ میاں کی یادگار قایم کی جائے۔ چندے کے لیے فہرست بنائی۔ بازو پر کالا کپڑا باندھے چندہ وصول کرتی پھرتی ہیں۔ یہ یادگار بنانے کی بات بھی اُن کے لیے ہے جو نامی اور نامور ہیں۔ نہیں تو.... مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔ اِدھر میاں مرے اُدھر بیوی نے دوسری شادی کی۔

یہ اوپر کی صورت بھی جب ہے کہ اولاد نہ ہو یا کم ہو یا کوئی ایسی صورت ہو کہ بچّوں کے پالنے کی ذمہ دار سرکار ہو۔ اولاد سرکاری ادارے میں پلے تو یہ اس کے ساتھ ستم ہوگا جو بچّہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہ گیا ہو اُسے طرح طرح کی ذہنی بیماریوں سے واسطہ پڑے گا۔ ماں باپ اور اولاد میں جو محبت ہوتی ہے اس کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ہوگا کہ صاحبزادے بلند اقبال تو ہائی کورٹ کے جج ہیں اور والد بزرگوار کسی خیرات خانے کے ٹکڑے توڑ رہے ہیں۔

شاید ان باتوں کا خیال کر کے ہی مرزا اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عورت کا کام ہے گھر کے اندر کا کام سنبھالنا، گھر گرہستی دیکھنا، بچوں کی پرورش کرنا اور مرد کا کام باہر کے معاملات کو سنبھالنا، کمانا اور ضرورت کی چیزیں مہیا کرنا ہے۔ اگر دونوں میں سے کسی نے اپنا فرض پورا نہیں کیا تو وہ خدا کا بھی گنہگار ہے اور بندوں کا بھی قصوروار۔ نکھٹو میاں شوہر بننے کے لائق نہیں اور پھوہڑ عورت بیوی بننے کے قابل نہیں۔

جس لڑکی سے مرزا صاحب نے اپنے بیٹے احمد علی کا رشتہ طے کیا تھا اس کا نام سکینہ تھا۔ دس گیارہ برس کی عمر تھی۔ بھولی بھالی صورت تھی۔ ماں باپ دونوں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کے پالنے کی ذمہ داری خالہ نے اپنے سر لے لی تھی مگر اللہ کی مرضی کہ وہ بھی چل بسیں۔ سکینہ اس وقت صرف سات برس کی تھی۔ خالو اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بیوی کے مرنے کے بعد انہوں نے اس کی دیکھ بھال کی مگر انہوں نے دوسری شادی کر لی تو اُن کی بیوی نے اِس بچّی کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ سکینہ کے خالو بیچارے بہت ہی غریب آدمی تھے۔ مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ سال بھر کے بعد ایک دیسی ریاست سے سو روپے ملتے تھے۔ اس میں چار بچوں کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ وہ تو سکینہ کا نصیب اچھا تھا کہ مرزا صاحب اس پر مہربان ہو گئے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ احمد علی صرف پندرہ برس کا تھا اور مڈل کلاس میں پڑھتا تھا۔ مرزا نے طے کیا کہ یہ انٹرنس پاس کر لے تو شادی کر دیں۔ مرزا بچپنے کی شادی کے تو خلاف تھے مگر کہا کرتے تھے کہ لڑکے لڑکی کی شادی جوان ہوتے ہی کر دینی چاہیے۔ انہوں نے سکینہ کو اس کے خالو سے مل کر اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اولاد کی طرح پرورش کرنے لگے۔ سکینہ دبی دبائی لڑکی تھی۔ مرزا صاحب کی بیوی نے جلدی اسے اپنے ڈھنگ پر لگا لیا اور تین برس کے بعد احمد علی سے اس کی شادی کر دی۔

مرزا کا خیال تھا کہ داماد کو بھی اسی طرح تعلیم دینی چاہیے مگر انہوں نے کسی لڑکے کو پرورش

نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح صاحبزادے سسرال کے ٹکڑے توڑنے کے عادی ہوجائیں گے اور پھر ساری زندگی کوئی کام نہ کرسکیں گے۔ لڑکی ایسے لڑکے سے نہیں دبے گی۔ ہمیشہ زندگی تلخ رہے گی۔ لڑکی بیاہ کے قابل ہوگئی تھی۔ اتنے میں مرزا کے ایک دوست واحد حسین نے اپنے بیٹے کا پیام دیا۔ مرزا کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ یہ رشتہ ہوگا مگر وہ اپنے دوستوں کی اولاد سے خاص تعلق رکھتے تھے اور اُن کی تعلیم کے معاملے سے دل چسپی رکھتے تھے۔ اس لیے مرزا اس لڑکے سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے یہ رشتہ فوراً منظور کرلیا۔

شادی کے سلسلے کی ساری فضول رسموں کو مرزا نے ترک کردیا۔ خاص خاص دوستوں کی دعوت کے سوا اور کسی قسم کا سامان نہیں کیا گیا۔ نہ طوائفیں ناچیں نہ بھانڈوں کو بلایا گیا۔ لڑکے کی شادی میں تو دونوں طرف کا اختیار مرزا صاحب کو ہی تھا۔ لڑکی کے خالو بس شریک ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی خوشی سے جو کچھ دیا اُسے مرزا نے شکر گزاری کے ساتھ قبول کرلیا۔ لڑکی کی شادی میں پہلے سے طے کرلیا گیا تھا کہ مانجھا، ساچق، برات کچھ بھی نہ ہوگا۔ صرف شرعی عقد ہوگا۔ دولہا کی ماں ڈومنیوں کو بلانا چاہتی تھی مگر مرزا صاحب نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ شربت پلائی کی رسم کو مرزا بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اس لیے اکثر عزیزوں اور دوستوں سے بگڑ گئی۔ بیٹا بیٹی کی شادی کے بعد مرزا کے کندھوں سے گویا بھاری بوجھ اُتر گیا۔

اب انہوں نے لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں میں خود کاشت کی۔ سال میں صرف ایک دو مہینے لکھنؤ میں گزرتے۔ باقی زمانہ کھیت میں گزرتا۔ شہر میں مرزا کا دل نہ لگتا تھا اس لیے کہ یہاں اُن کی دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ انہیں دو چیزوں کا شوق تھا جسمانی محنت اور کتابوں کا مطالعہ۔ شہر کے لوگوں کو ان دونوں چیزوں سے گویا نفرت تھی۔

5

مرزا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی اس میں بہت سی خرابیاں تھیں مگر وہ ان کے بُرے اثر سے محفوظ رہے۔ البتہ انہوں نے اچھے لوگوں کی پیروی ضرور کی۔ مثلاً سید جعفر حسین صاحب سے اُن کا خاص تعلق تھا۔ سید صاحب کی زندگی ملک اور قوم کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ شروع سے ان کی جسمانی صحت اس قابل نہ تھی کہ محنت مشقت کا کام کر سکتے۔ صحت کی وجہ سے اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ مڈل کلاس تک پہنچے تھے کہ بیماری کی وجہ سے اسکول چھوڑنا پڑا۔ مگر وقت ضایع نہ کیا۔ رُڑکی کالج کے داخلے کا امتحان پاس کیا اور وہاں داخل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے اپنی محنت اور چال چلن سے اپنے استادوں کو بہت خوش رکھا۔

سید صاحب کے ہم جماعت لکھنؤ کے ایک اور صاحب تھے۔ دونوں ہم وطن ہونے کی وجہ سے ایک ہی بارک بلکہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ یہ صاحب حد درجے کے کاہل اور فضول خرچ تھے۔ اس کے علاوہ شاعری کا خبط تھا۔ اپنا کورس پڑھنے اور یاد کرنے کے بجائے غالبؔ اور ذوقؔ کے دیوان حفظ کرتے تھے۔ سرِ شام دوستوں کو گھیر کے بیٹھ جاتے اور آدھی رات تک ان کا وقت برباد کرتے۔ ساڑھے دس بجے جب کالج کا گھنٹہ بجتا تو سو کے اٹھتے تھے۔ پھر بھی جی چاہا تو کلاس گئے ورنہ کمرے میں پڑے رہے۔ ماہانہ امتحان کی تیاری کرنا تو قسم تھا۔ امتحان سے ایک دن پہلے جب طلبا آپس میں مباحثہ کرتے تو یہ بھی خدا کا خوف کر کے اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ پھر بھی اللہ کا کرم یہ ہوا کہ فیل نہ ہوتے۔ بس اتنے نمبر پا لیتے تھے کہ پاس ہو جائیں۔ اس کامیابی پر بڑا فخر تھا۔ سالانہ امتحان میں بھی پاس ہو گئے۔ نوکری بھی مل گئی مگر ایسے کاہل اور بد دماغ سے نوکری کیا ہوتی۔ ڈیڑھ دو برس بعد وہاں سے نکالے گئے۔ اس کے بعد سرکاری نوکری نہ ملی۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کس

حال میں ہیں۔

اِن صاحب نے رُڑکی کالج چھوڑا تو سید صاحب کا بیٹا چھوٹا تھا۔ اب اُنہوں نے جم کے محنت کی۔ آخری امتحان میں دوسرے درجے میں کامیاب ہوئے اور ایک مضمون میں انعام بھی پایا۔ اس کے بعد نہر کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ اور اب بھی کسی اونچے عہدے پر ہیں۔ مرزا صاحب نے انجینیری کا امتحان اُن کے مشورے پر پاس کیا تھا۔ انہوں نے صرف مشورہ ہی نہ دیا بلکہ بہت کچھ سکھایا بھی۔ چنانچہ دونوں میں بڑا خلوص تھا اور گہری دوستی تھی۔ سید صاحب مرزا کی بڑی قدر کرتے تھے اور مرزا صاحب سید صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ دونوں کی دلچسپیاں بھی ایک جیسی تھیں۔ شعروشاعری سے اِن کو نفرت تھی تو اُن کو بھی تھی۔ یہ نہیں کہ شعر سمجھنے کا سلیقہ نہ ہو لیکن دونوں حقیقت کی دنیا میں ایسے غرق تھے کہ خیالی باتوں کو ہیچ پوچ سمجھتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سید جعفر حسین صاحب کے وہ ہم وطن جن کا ذکر اوپر آچکا ہے بڑے شوق سے داغ دہلوی کا تیسرا دیوان خرید کے لائے۔ سید صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔ دیوان اٹھا کے دیکھنے لگے۔ جانے کتنے شعروں پر تو چھری پھری اور جانے کتنے شعروں کے عیب اُن کے سامنے لکھ دیے۔ بس یہی حال مرزا صاحب کا تھا۔ میکینکس میں دونوں کی لیاقت اعلیٰ درجے کی تھی۔ روزانہ نئی نئی کلوں کے نقشے بنا کرتے تھے۔ اگر ممکن ہوا تو اُن کے نمونے بھی بنوائے گئے ورنہ آرزوئیں دلوں میں رہ گئیں۔

6

مرزا عابد حسین کے عزیزوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی زندگی کامیاب زندگی ہو یا جس کی سیرت سے مرزا کو کوئی فائدہ پہنچا ہو۔ ان کے دور کے عزیزوں میں ایک صاحب مرزا فدا حسین تھے بڑے تباہ حال اور پریشان۔ تھوڑی فارسی جانتے تھے بچپن سے شعر و شاعری کا خبط تھا۔ اس نے مزاج کو اور نازک کر دیا تھا۔ مرثیہ خوانی کے شوق نے صبر و قناعت کا سبق پڑھا دیا تھا۔ ہر سال محرم میں کسی سرکار سے پچیس روپے مل جاتے تھے۔ کھانے والے پانچ تھے۔ ایک خود، ایک بیوی، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ اتنی کم آمدنی میں کیا ہوتا۔ غریبی کے پنجے میں ایسے پھنسے تھے کہ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اتنی ہمت اور عقل نہ تھی کہ خود کوئی تدبیر سوچتے۔ جو لوگ لکھنؤ کی زندگی سے واقف ہیں ان سے تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر باقی لوگوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہاں کے لوگوں کو محنت کرنا اور کمانا نہیں آتا۔ نیک اور جائز ذریعے سے روزی کمانا یہاں کے لوگ ناممکن سمجھتے ہیں۔

دنیا بھر میں روپیہ کمانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کوئی ہنر سیکھتا ہے، کوئی دستکاری سے کماتا ہے، کوئی نوکری کرتا ہے۔ کسی کے پاس کچھ مال ہے تو دکان کھول لیتا ہے، کارخانہ شروع کر دیتا ہے مگر یہاں اس قسم کی کوشش کرنے والے معمولی درجے کے لوگ اور چھوٹی امت والے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بیٹے بیٹیوں کی شادیوں میں مشکلیں پیش آتی ہیں۔

ہاں تو مرزا فدا حسین کا ذرا سا حال سنیے۔ کسی زمانہ میں مرزا صاحب میرٹھ میں اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ انہیں دنوں مرزا فدا حسین کسی رئیس کے مکان پر مرثیہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ مرزا صاحب بھی مجلس میں آئے۔ وہیں مرزا فدا حسین سے ملاقات ہوئی۔ رشتے داری تھی اس لیے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور کھانے کا اہتمام کیا۔ ایک دن مرزا صاحب سے

اپنے گھر بھی مجلس پڑھوائی۔ چلتے وقت اس رئیس نے پچیس روپے دیے تھے۔ ان کی غربت کا حال مرزا صاحب سے بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ انہوں نے بھی مجلس پڑھوانے کے بہانے پچاس روپے دیے۔

دوسرے سال مرزا فدا حسین پھر آئے۔ اب وہ غربت سے بہت تنگ آ چکے تھے۔ مرزا سے کہا کہ ہو سکے تو روزگار کی کوئی صورت کر دیجیے۔ انہوں نے کہا روزگار کی صورت تو ہو سکتی ہے بشرطیکہ آپ محنت کرنے پر راضی ہوں۔ فدا حسین بہت تنگ تھے انہوں نے یہ منظور کر لیا۔ مرزا نے صاحب سے کہہ کے انہیں محرر لگوا دیا۔ پندرہ روپے مہینہ تنخواہ تھی۔ فدا حسین لکھنؤ جا کر اپنے بیوی بچوں کو لے آئے اور انہیں مرزا صاحب کے گھر ہی اتارا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی سکینہ بیگم نے مزاج بھی نرالا پایا تھا۔ اوّل تو عادتیں بہت خراب تھیں۔ صبح کو دیر تک پڑی سوتی رہتی تھیں۔ پھر اٹھتیں تو وقت ضایع کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ یہی حال بچوں کا بھی تھا۔ لکھنؤ کے باہر کے جتنے طور طریقے تھے وہ سب انہیں ناپسند تھے چاہے وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ مرزا فدا حسین کے دل میں کیا تھا یہ تو پتہ نہیں لیکن ان کی بیوی تو یہی سمجھتی تھیں کہ مرزا صاحب کی ہی کوئی غرض ہے کہ انہوں نے ان کے شوہر کو نوکر رکھوایا ہے۔ اس لیے مرزا صاحب کی بیوی جتنی خاطر داری کرتیں یہ سمجھتیں کہ وہ ان کی خوشامد کر رہی ہیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ نوکری قبول کر کے ان کے شوہر نے مرزا عابد حسین پر بڑا احسان کیا ہے اس لیے ان سے اور بھی زیادہ خاطر داری کی امید رکھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بے مطلب کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی کو سب سے زیادہ غصہ تو اس بات پر تھا کہ ان لوگوں نے ان سے لکھنؤ چھڑوا دیا۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو عابد حسین اور ان کے بیوی بچوں کو کولھو میں پلوا دیتیں۔ اٹھتے بیٹھتے زبان پر یہ تھا کہ ہائے پندرہ روپلّی کے لیے گھر بار چھوٹا اور جنگل میں آ کے رہنا پڑا۔ کیوں بہن رقیہ بیگم یہاں کوئی مر جائے تو کیا ہو۔ کھٹیا پر اٹھوایا جائے۔

فاتحہ درود بھی اچھی طرح سے نہ ہو۔ تمہارے میاں کا اللہ بھلا کرے کیسے جنگل اجاڑ میں لا کے ڈال دیا۔ نہ کوئی اپنا عزیز نہ ساتھی۔ میری تبولی (بیٹی کا نام) کو تیسرا سال لگ گیا ہے۔ شہر میں ہوتی تو دودھ بڑھاتی نذر نیاز ہوتی۔ چار اپنے پرائے جمع ہو جاتے۔ ذاکر (بڑا بیٹا) کو پندرھواں سال ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں۔ اس کا کونڈا کرنا ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ آپڑی کہ ہرمزی (بڑی بیٹی) کو نواں برس ہے۔ شہر میں ہوتی تو اس کے رشتے کا بندوبست کرتی۔ مشاطہ کو بلوا کے کہیں سے رقعہ منگاتی۔ ہم تو یہاں آ کے عاجز آ گئے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ باز آئے ہم تو اس پندرہ روپلی کی نوکری سے۔ باہر کے پلاؤ سے اپنے گھر کے چنے اچھے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی رقیہ بیگم بہت نیک تھیں۔ لڑنا جھگڑنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر پندرہ روپلی کا طعنہ اتنی بار سنا تھا کہ کلیجہ پک گیا تھا۔ ایک آدھ بار منہ کھولنا ہی پڑا۔ ان کا بولنا تھا کہ اچھی خاصی لڑائی ٹھن گئی۔ بی سکینہ بیگم آپ ہی آپ خفا ہو گئیں۔ بات چیت بھی بند کر دی۔

اس خاندان کی عادتیں بالکل ہی بگڑی ہوئی تھیں۔ سب کو دن چڑھے سو کر اٹھنے کی عادت تھی۔ روزہ نماز تو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ رقیہ بیگم منہ اندھیرے اٹھ جاتی تھیں۔ اپنے ساتھ بیٹی اور بہو کو بھی اٹھا کے نماز پڑھواتی تھیں۔ اس کے بعد کلام پاک کی تلاوت ہوتی تھی۔ خادمائیں کھانا تیار کرتی تھیں۔ بیویاں کتابیں پڑھ رہی ہیں یا کچھ سی پرو رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ مرزا کی طرح سارا خاندان محنتی اور جفاکش تھا۔ گھر کا ہر آدمی وقت برباد کرنے کو گناہ سمجھتا تھا، ہر وقت کام سے لگا رہتا۔

فدا حسین کا کنبہ ان کے بالکل برعکس تھا۔ رقیہ بیگم نے دیکھا کہ کئی وقت گزر گئے اور سکینہ بیگم نے نماز نہ پڑھی تو انہیں حیرت ہوئی۔ کچھ کہنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ آخر ایک دن بات چھیڑی۔

رقیہ بیگم: بھابی! مجھے ایک بات پر بڑی حیرت ہے لیکن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کہوں۔

سکینہ بیگم: ہاں ہاں ضرور کہو۔ بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔

رقیہ بیگم: کئی دن ہو گئے مگر میں نے آپ کو یا بچوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ بھائی صاحب کی اذان اور نماز کی آواز تو اکثر آتی ہے۔

سکینہ بیگم: شاید وہ پڑھتے ہیں۔

رقیہ بیگم: ہائیں۔ یہ شاید کیسا؟ اور آپ خود کیوں نہیں پڑھیں؟

سکینہ بیگم: رمضان اور محرّم میں تو وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ویسے کبھی پڑھ لی اور کبھی نہ پڑھی۔

رقیہ بیگم: یہ کیوں۔ کیا نماز صرف رمضان اور محرّم ہی میں فرض ہے؟

سکینہ بیگم: اب یہ تو مولوی لوگ ہی جانیں۔ میں نے تو جو دیکھا کہہ دیا۔

رقیہ بیگم: خیر یہ بتائیے کہ آپ کیوں نہیں پڑھتیں؟

سکینہ بیگم: یہ بھی ایک کم بختی کی مار ہے۔ بات اتنی ہے کہ میری طبیعت میں شک ہے۔ ذرا چھینٹ پڑنے کا شبہ ہوا تو میرا نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

رقیہ بیگم: آپ تو جانتی ہیں کہ شبہ میں ڈالنے والا شیطان ہے۔ شبہے سے نماز چھوڑنا کیا ہے!

سکینہ بیگم: اے ہے بھابی۔ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تم سے کون دلیلیں کرے۔ اچھا اب نہاؤں گی تو ضرور نماز پڑھوں گی۔

رقیہ بیگم: جان بوجھ کے نماز قضا کرنے کا بڑا گناہ ہے۔ آپ نے کہہ دیا کہ اب کے نہاؤں گی تو ضرور پڑھوں گی۔ ابھی پرسوں تو آپ نہائی تھیں۔

سکینہ بیگم: نہائی تو تھی پر چھینٹ پڑ گئی۔ کپڑے غارت ہو گئے۔

رقیہ بیگم: جہاں چھینٹ پڑ گئی اسے دُھو دیجیے اور شوق سے نماز پڑھیے۔

سکینہ بیگم: اب یہ کیا معلوم کہاں چھینٹ پڑ گئی۔

رقیہ بیگم: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے چھینٹ پڑتے دیکھا نہیں ورنہ ضرور معلوم ہوتا کہ کہاں چھینٹ پڑی۔

سکینہ بیگم: ہاں میں تو خود ہی کہتی ہوں کہ شبہ ہے۔

رقیہ بیگم: شبہے میں نماز نہیں چھوڑی جا سکتی۔

سکینہ بیگم: گندے کپڑوں میں مجھ سے تو نماز نہ پڑھی جائے گی۔ ایسی نماز کے قربان

رقیہ بیگم: ہاں تو یہ کہئے کہ نماز نہ پڑھیے گا۔ جب آپ ہی نہ پڑھیں تو بچے بھلا کیوں پڑھنے لگے۔

اس دن سے رقیہ بیگم سکینہ بیگم سے مایوس ہو گئیں۔

ادھر سکینہ بیگم کا یہ حال تھا کہ جہاں انہیں اور شکایتیں تھیں ان میں ایک یہ تھی کہ ہائے کہاں لا ڈالا ہے جہاں اذان کی آواز نہیں آتی، ماتم کی آواز نہیں آتی۔ شام ہوئی اور گیدڑ بولنے لگے۔ جب سے نماز کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی اس دن سے اذان کا ذکر تو خیر ختم ہو گیا مگر ماتم کی آواز نہ آنے کی شکایت باقی رہی۔ بلکہ اس دن سے ماتم کے لفظ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کی ایک برائی سب پر ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ اپنی کسی ایک خوبی پر زیادہ زور دینے لگتا ہے تاکہ وہ عیب ذرا دب جائے اور پتہ نہ چلے اور ایک جگہ جو ذلت ہوئی ہے اس کی کمی دوسری طرف پوری ہو جائے۔ بار بار ماتم کا ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نماز کے پابند نہیں ہیں تو نہ سہی مگر ماتم کے شوقین رقیہ بیگم سے زیادہ ہی ہیں۔ مرزا عابد حسین کے گھر میں ماتم اور نوحہ خوانی کا ذکر نہ تھا مگر خدا کے فضل سے چھوٹا بڑا ہر ایک مذہبی تاریخ سے واقف تھا۔ پیغمبر اور اہل بیت پر سب جان و دل سے فدا تھے۔ ذکر اہل بیت کو عبادت سمجھتے تھے مگر وہ حال نہ تھا جو فدا حسین کی بیوی کا تھا کہ ہر جمعرات کو حلوا پکا کر دیا

منگائیں۔ کھڑے ہو کے الٹے سیدھے دو بول پڑھے اور "حسین حسین" کہہ کے سینہ پیٹ لیا۔
رقیہ بیگم کچھ دنوں تو چپ رہیں مگر ایمان کی بات ہے کہ کب تک جواب نہ دیتیں۔ آخر ایک دن بات کرنی ہی پڑی۔
رقیہ بیگم: بہن کیا تم ہر جمعرات کو ماتم کرتی ہو؟
سکینہ بیگم: ہاں بہن سو کام دنیا کے کرتے ہیں۔ کوئی کام ایمان کا بھی تو کرنا چاہیے۔ آخر ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے۔
رقیہ بیگم، مگر آپ نماز تو پڑھتی نہیں جو ایمان کا اصل کام ہے۔
سکینہ بیگم: اچھا نماز نہیں پڑھتے نہ سہی۔ آٹھویں روز کا ماتم تو ناغہ نہیں ہونے پاتا۔
رقیہ بیگم: ایسے ماتم سے کوئی فائدہ نہیں۔ نماز نہیں پڑھتیں تو ماتم سے کیا حاصل؟
سکینہ بیگم: بہن توبہ کرو۔ کفر نہ بکو۔ ماتم کو تم ایسا کہتی ہو۔
رقیہ بیگم: میں سچ کہتی ہوں۔ امام حسینؑ اس بات سے ہرگز خوش نہ ہوں گے کہ آپ خدا کے فرض کو تو چھوڑ دیجیے اور ان کا ماتم کیجیے۔
سکینہ بیگم: یہ تم نے کیا کہا؟ ماتم ایک پر ایک ہے۔
رقیہ بیگم: مگر نماز ہزار پر ایک ہے۔ بغیر نماز کے ماتم کام نہ آئے گا۔
سکینہ بیگم: اے ہے بھابی! باہر رہنے سے تو تمہارا ایمان بھی خراب ہو گیا۔ اور وہ کیا لیتے ہیں۔ ہاں یاد آیا نیچری۔ تمہارے میاں نیچری ہیں۔ میاں کے ساتھ تم نے بھی اپنا ایمان کھویا۔ تب ہی تو ماتم کو ایسا کہتی ہو۔ آل اولاد والی ہو، ایسی باتیں تو نہ کرو۔
رقیہ بیگم: آل اولاد کو آخر اس میں کیا ضرر ہے؟
سکینہ بیگم: تو تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔ آل اولاد کا ذلل (ضرر) تو ہوتا ہی ہے۔ خدا بھی کوئی لاٹھی لے کے مارتا ہے۔ اس کی باتوں میں کھوٹ نکالتی ہو آخر اس کی سزا کچھ نہ کچھ تو ہونی ہی چاہیے۔ یا دیدوں گھٹنوں کے آگے آئے یا خدا نخواستہ شیطان کے کان بہرے ہوں۔ اولاد

کے دشمنوں پر بن آئے۔ ہر جمعرات کو میں ماتم کیا کرتی تھی۔ شامت کی ماری تین جمعراتوں کو ناغہ ہو گیا۔ تبولی کی ایسی حالت ہو گئی کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ آخر مجھے خواب دکھائی دیا کہ تو ہمارا ماتم کیا کرتی تھی۔ ناغہ کیا تو پائی نہ اس کی سزا۔ اگلے ہی دن سے میں نے دن میں تین دفعہ ماتم کرنا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا تبولی کی حالت سنبھلنے لگی۔

رقیہ بیگم: بھابی توبہ کرو۔ امام حسینؑ کو بھی تم نے اپنا سا سمجھ لیا کہ ذرا سی بات ہوئی اور وہ روٹھے۔

سکینہ بیگم: ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم مجھ کو عید بقرعید کا حصہ بھیجتی ہو۔ اگر تم ناغہ کرو تو مجھے رنج ہو گا کہ نہیں۔

رقیہ بیگم: مجھے تو آپ کہتی ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ دین کی باتیں بالکل نہیں جانتیں

سکینہ بیگم: سچ ہے اپنی ہائی اور دہائی پر گونگائی۔ جیسے تم دین کو بھول گئیں ایسا ہی تم اوروں کو سمجھتی ہو۔ شیعہ مومن ہو کے ماتم کو کچھ نہیں سمجھتیں۔

رقیہ بیگم: میں ماتم کو کچھ سمجھتی ہوں یا نہیں یہ تو میرا اپنا دل ہی جانتا ہے۔ مگر اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ آپ مسلمان ہو کے نماز کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتیں۔ نہ خود نماز پڑھتی ہیں نہ بچوں کو سکھاتی ہیں۔ جہاں تک روزے نماز کا تعلق ہے ہم سے جہاں تک یہ ہو سکے کرتے ہیں۔ اللہ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن کاموں سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ذکرِ حسین بھی کرتے ہیں۔

سکینہ بیگم: ہم نے تو ایک دن بھی نہیں دیکھا؟

رقیہ بیگم: (ہنس کر) آپ تو دیکھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ آپ تو اس وقت سو رہی ہوتی ہیں۔

اس جواب سے سکینہ بیگم شرمندہ سی ہو گئیں اور کسی دن حدیث یا ذکرِ حسین سننے کا وعدہ کر لیا مگر ان کے مقدر میں سویرے اٹھنا کہاں تھا کہ نیک باتیں سنتیں۔ اس اللہ کی بندی میں ایک عیب اور تھا۔ وہ یہ کہ بات بات میں منہ سے گالی نکلتی تھی۔ مزے کی بات، یہ بگڑی ہوئی ہوں تو غصے کی گالی اور خوش ہوں تو پیار کی گالی۔ بچوں سے بات ہو تو

گالی ایسے استعمال ہوگی جیسے تکیہ کلام - ہر مزی بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی ... چھوٹی لڑکی نے ابھی بولنا سیکھا تھا تو اسے بھی گالیوں کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ جب اس کے منہ سے گالیاں نکلتیں تو اماں باغ باغ ہو جاتیں۔

برخوردار چودہ برس کے ہو گئے تھے اور پھبتی کسنے میں طاق تھے۔ کنکوے کا شوق انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ یہاں کنکوے کا کیا ذکر۔ آخر انہوں نے ایک دن مرزا صاحب کے دفتر سے ٹریسنگ کلاتھ لیا۔ پیمائش کی جھنڈی کا بانس لے کر کانپ ٹھڈا بنایا۔ اماں کی پنکھوں سے ڈور کا کام لیا۔ یعنی پتنگ بازی کا سب سامان حاضر ہو گیا۔

ایک دن کنکوا ٹوٹ کے کسی غریب کے کھیت میں جا گرا۔ یہ اس کی ہری بھری کھیتی کو روندتے ہوئے پہنچے اور کنکوا اٹھا لائے۔ کئی بار ایسا ہی ہوا۔ کسان بیچارہ خون کا سا گھونٹ پی کے چپ ہو رہا۔ آخر ایک دن تنگ آ کے مرزا صاحب سے شکایت کی۔ انہیں سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کنکوا کہاں سے آیا۔ جب منگا کے دیکھا تو یہ راز کھلا۔ بہت غصہ آیا۔ دفتر والوں کو ہدایت کی کہ یہ صاحبزادے اب دفتر میں نہ گھسنے پائیں۔ ٹریسنگ پیپر بازار سے منگا کر دفتر میں جمع کرایا۔

مرزا صاحب کے رہنے کو جو بنگلہ ملا تھا اس کے پاس ہی ایک سرکاری باغ تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی مرزا صاحب کے سپرد تھی۔ ہر سال اس کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کے گھر پھل اور ترکاریاں بازار سے آتیں اور کبھی ٹھیکے دار سے لی جاتیں تو اس کو پوری قیمت دی جاتی۔ ان صاحبزادے نے باغ کے کچے پکے پھل توڑنے اور برباد کرنے شروع کر دیے کبھی کبھی میاں ذاکر ان پھلوں میں سے اپنی اماں کو بھی حصہ دیتے اور وہ اللہ کی بندی بھی کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کرتی کہ یہ پھل آئے تو کہاں سے آئے؟

ایک دن مرزا صاحب کو اس بات کا بھی پتہ چل گیا۔ انہیں بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے لڑکے کو بلا کے سخت سست کہا اور غصے میں یہاں تک کہہ گئے کہ "یہ چوری ہے۔ آئندہ ایسی

حرکت کی تو تمہیں تھانے بھیج دوں گا۔" ان کی اماں تو کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرنے کی فکر میں لگی ہی رہتی تھیں۔ مرزا صاحب کا یہ کہنا ایسا ہو گیا جیسے کسی نے جلتے پہ تیل ڈال دیا ہو۔ کوئی کوسنا نہ چھوڑا کوئی گالی نہ اٹھا رکھی "غارت ہو تھانے بھیجنے والا۔ دو نارنگیاں توڑ لیں تو قیامت آگئی۔ میں تو ایسی دس ہزار نارنگیوں کو صدقے اتار دوں۔ بڑے عزیز بنے ہیں۔ سچ ہے اس زمانے کے عزیز بھی یزید ہوتے ہیں۔"

رقیہ بیگم سے نہ رہا گیا تو وہ بھی بول پڑیں۔ پھر تو دھڑا دھڑی کی لڑائی ہوئی۔ بیچاری رقیہ بیگم لڑنا تو جانتی نہ تھیں مگر جو کچھ سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

رقیہ بیگم: بھابی! آپ اتنا خفا کیوں ہوتی ہیں۔ آخر اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ ذاکر نے سرکاری باغ سے نارنگیاں اور امرود چُرائے۔ اس پر اگر انہوں نے سختی کی تو کیا غلط کیا؟

سکینہ بیگم: یہی تو بات ہے۔ جب کوئی چوری کا نام لیتا ہے تو میرے آگ لگ جاتی ہے اس میں چوری کی کیا بات ہے۔ اپنے چچا کا باغ سمجھ کے دو پھل توڑ لیے۔ بس غضب ہو گیا۔ آخر روز پھل پھلاری دہیں سے تو آتی ہے۔ سارا گھر کھاتا ہے کہ نہیں۔

رقیہ بیگم: اس باغ سے جو کچھ آتا ہے مول لیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات آپ کی سمجھ میں کہاں آتی ہے؟

سکینہ بیگم: واہ واہ یہ اچھی رہی۔ کسی نے آج تک سُنا ہے کہ اپنے باغ کی چیزیں مول لی جاتی ہیں۔

رقیہ بیگم نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ باغ سرکاری ہے، سرکاری ملازموں کا کام ان کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ یہ نہیں کہ مُفت پھل سبزی کھائیں۔ اس باغ کا ٹھیکہ ہر سال دیا جاتا ہے اور آمدنی سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتی ہے مگر وہ یہی کہتی رہیں کہ آدھا تہائی جمع ہوتا ہو گا۔ باقی دیکھ بھال کرنے والوں کے پیٹ میں جاتا ہو گا۔ آخر دیکھتا کون ہے۔ اگر بچے نے ایک آدھ پھل توڑ لیا تو کون سرکار کو خبر کرنے جائے گا؟

رقیہ بیگم: بھابی! سرکار نہ دیکھے مگر خدا تو دیکھتا ہے۔ چوری تو چوری ہی ہے۔ پھل کی ہو، ترکاری کی ہو یا پیسے کی۔

سکینہ بیگم: ہم نے تو کہیں سنا نہیں کہ ککڑی کے چور کی گردن ماری جاتی ہو۔ پھل پھلاری تو ہوتا اسی لیے ہے کہ جس کے ہاتھ لگا اس نے توڑ لیا۔ ہماری خالہ کے ہمسائے میں بیری کا پیڑ تھا۔ سب بچے اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ بیری والی دوپہر میں سوئی اور ہم نے مارے اینٹ پتھروں کے ستھراؤ کر دیا۔ اب وہ اٹھی تو چیخ چلا رہی ہے۔

رقیہ بیگم: وہ بیچاری تو چیخ چلا کے بیٹھ رہتی ہو گی۔ مگر یہ سرکاری مال ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پچھلے سال ایک آدمی نے پانچ کیریاں توڑ لی تھیں۔ دو مہینے کی قید ہو گئی۔

سکینہ بیگم: اچھا بی بس کرو۔ ہم تو چور اچکے ہیں اور تم یہاں کی حاکم ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ پھانسی دلا دو ہمیں۔ چار ٹکے والی کیا ہو گئیں تمہارا تو زمین پر پاؤں ہی نہیں پڑتا۔

اس پر رقیہ بیگم جھنجلا کر بولیں کہ آپ بات تو سمجھتی نہیں۔ خواہ مخواہ طعنے دیے جاتی ہیں۔ یہ سن کر وہ اور آگ بگولا ہو گئیں اور ایسی ایسی سنائیں کہ رقیہ بیگم نے کبھی سنی نہ ہوں گی۔ مگر بیچاری صبر کرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔

اس کے بعد کچھ دن اور خاموشی سے گزر گئے۔ دونوں بیبیوں میں نہ کوئی خاص بات ہوئی نہ جھگڑا مگر لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور سکینہ بیگم موقعے کی تلاش میں رہیں کہ کوئی بات ہاتھ آئے اور وہ کڑوی کسیلی سنائیں۔ آخر ایک دن یہ موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن کسی دوست نے مرزا صاحب کو تحفے میں پھل بھیجے۔ ذاکر اس وقت ان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ مرزا صاحب کو خیال آیا کہ اس دن انہوں نے ذاکر پر سختی ذرا زیادہ ہی کر دی تھی۔ اس لیے اب انعام دینا ضروری ہے۔ یہ ابھی بچہ ہی تو ہے۔ سرکاری اور نجی جائیداد کا فرق کیا جانے۔ ممکن ہے اس دن اس نے چچا کا باغ سمجھ کے پھل توڑ لیے

ہوں۔

اس خیال کے آتے ہی انہوں نے وہ پھل ذاکر کو دے دیے۔ کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ وہ پھل لے کر کھاتا ہوا خوش خوش گھر پہنچا۔ اس کی ماں کو پتہ چلا کہ یہ پھل مرزا صاحب نے دیے ہیں تو بس پھٹ ہی تو پڑی۔ پہلے تو پھلوں کو پیروں سے مسلا پھر جوتی لے کر ذاکر پر پھیل پڑی۔

"چولھے میں جائیں یہ امرود۔ غارت ہوں یہ نارنگیاں۔ کھانے والا مرے۔ دو گھڑی میں ہیضہ ہو جائے۔ موا کیسا ٹھکر ٹھکر کھا رہا ہے۔ جوتیاں کھا چکا، جیل جا چکا۔ موا بے غیرت۔ ایسے امرود اور نارنگیاں کھانے سے تو بُری چیز کھائی ہوتی۔"

رقیہ بیگم نے ذاکر کو پٹتے دیکھا تو برداشت نہ ہوا بچانے لگیں۔ اب وہ ان پر سیدھی ہو گئی "بی بی تم کون ہوتی ہو بیچ میں بولنے والی۔ ہم اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہیں۔ تم سے کیا مطلب؟

رقیہ بیگم: بہن اس دن انہوں نے اپنا بچہ سمجھ کے نصیحت کر دی تو اس میں کیا بُرائی ہو گئی۔

سکینہ بیگم: تم لوگوں کی تو وہ مثل ہے کہ سر پر جوتی اور منہ میں روٹی۔ اس دن ذلیل کر دیا آج پھلوں کے تحفے دیے جاتے ہیں۔ میں تو آگ لگا دوں ایسے پھلوں کو۔ بھلے آدمی کو ایک بات اور بھلے گھوڑے کو ایک چابک۔ (اتنا کہہ کے وہ پھر ذاکر کو دھواں دھوں پیٹنے لگیں۔ رقیہ بیگم نے بڑی مشکل سے بچایا)

رقیہ بیگم: آپ پھر وہی باتیں لے بیٹھیں۔ اس دن تو کہتی تھیں میرا دل صاف ہو جاتا ہے۔

سکینہ بیگم: میں تمہیں کب کچھ کہہ رہی ہوں مگر جب تک اس موئے کا ڈھائی چلو خون نہ پی لوں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گی۔ جن نارنگیوں کی خاطر جوتے کھائے

پھر وہی نارنگیاں کھانے لگا۔ مُوا کنگلا۔ بے غیرت۔ یہ کیا اس کا باوا بھی بے غیرت ہے۔ تبھی تو مُوا بڑھاپے میں گھر بار چھوڑ کے پرائے ٹکڑوں پر آکے پڑا ہے۔

رقیہ بیگم: بھابی! میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ نہ بولوں مگر آپ زبان کھولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ نوکری کرنا عیب نہیں اور پرائے ٹکڑوں کی بات تو بہت ہی غلط ہے۔ ہماری کیا مجال کہ کسی کو ٹکڑے کھلائیں۔ دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے۔ خدا ایک کے ذریعے دوسرے کا بھلا کرتا ہے۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں۔

سکینہ بیگم: ارے موئی نوکری بھی ہو۔ پندرہ روپلّی کی نوکری کے لیے عمر بھر کا احسان ہو گیا۔ ساری عمر کسی کی نمک کی کنکری کا احسان نہیں اٹھایا۔ اب بڑھاپے میں ہمارے منہ کو کالک لگ گئی۔ میں تو ان ہی کو کہتی ہوں۔ تمہارے بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

رقیہ بیگم دیکھ رہی تھیں کہ اس عورت کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آسکتی۔ اسے سمجھانا بیکار ہے۔ وہ اٹھنے کا کوئی بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھیں کہ اتنے میں ان کے بیٹے باقر نے آواز دی اور یہ اُٹھ گئیں۔

باقر اللہ کے فضل سے مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا اور چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ بڑا ذہین، ہونہار اور نیک لڑکا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت کو اس طرح اول فول بکتے سنا تھا۔ اس نے تو علی گڑھ کا ہاسٹل دیکھا تھا جہاں سب لڑکے میل ملاپ سے رہتے ہیں۔ اپنے اور دوستوں کے والدین اور بزرگوں کا محبت اور ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ ان استادوں کو دیکھا تھا جو دوسروں کی بھلائی میں جی جان سے لگے رہتے ہیں۔ طعنے تشنے، گالیاں، کوسنے، بکنا، بڑبڑانا یہ سب اس نے کہاں سنا تھا۔ یہ سب باتیں اسے عجیب سی لگیں۔ اسے بڑا غصّہ آیا۔ آخر ماں کو بلا کے اصلیت دریافت کی۔

باقر کو پورے حالات اور سکینہ بیگم کے مزاج کا حال معلوم ہوا تو بہت دکھ ہوا۔ وہ

سوچنے لگا ایسے تو ماں کی صحت خراب ہو جائے گی۔ پھر اس طرح کے لوگوں کا گھر میں رکھنا بھی مناسب نہیں۔ رات کے کھانے پر اس نے ماں کی اجازت سے باپ سے گفتگو کی۔ انہوں نے بھی اتفاق کیا کہ اس طرح کے لوگوں کا گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔

آخر کار مرزا صاحب نے ایک راستہ نکالا۔ مرزا فدا حسین کی جس جگہ ڈیوٹی تھی وہ ہیڈ کوارٹر سے پچیس میل کے فاصلے پر تھی۔ وہاں معمولی سرکاری ملازموں کے لیے ایک دو ٹوٹے پھوٹے مکان تھے۔ مرزا صاحب نے ایک مکان کی مرمت کا بندوبست کرا دیا اور فدا حسین کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلالیں۔

سکینہ بیگم کو اس کی خبر ملی تو بڑی چراغ پا ہوئیں۔ رقیہ بیگم اور باقر کو ان گنت سنائیں کہ یہی جنگل میں پھنکوانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان بیویوں پر ہزار بار لعنت بھیجی جو ذرا ذرا سی بات اپنے شوہروں سے لگا دیتی ہیں۔ آخر ایک دن جانا ہی پڑا۔ عجیب سا گھر تھا تنگ کوٹھریاں، نیچی چھتیں۔ باہر جھانک کر دیکھا تو کوسوں تک جنگل ہی جنگل۔ دم گھٹنے لگا۔ رات ہوئی تو جنگل سائیں سائیں کرنے لگا۔ ڈر کے مارے ساری رات نیند نہ آئی۔

اگلے دن منّا چوکیدار کی بیوی منشی فدا حسین کی بیوی سے ملنے کو آئی ذرا دیر کو ایک سے دو ہو گئیں۔ سکینہ بیگم نے بہت گھل مل کے باتیں کیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں سے تین چار کوس کی دوری پر ایک گاؤں ہے وہاں سے سودا سلف منگانا پڑتا ہے۔ گوشت ہفتے میں ایک بار ہوتا ہے۔ آدمی دیر سے پہنچے تو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اتنے میں باہر سے مرزا فدا حسین آ گئے۔ انہوں نے منّا کی بیوی کو بیٹھے دیکھا تو اس دن کی تصویر ان کی آنکھوں میں پھر گئی جب سکینہ اور اس کے درمیان جھگڑا ہوتی ہوگی کئی بار سوچا منّا کو سمجھا دیں کہ اپنی بیوی کو نہ بھیجا کرے مگر یہ سوچ کے ٹال گئے کہ یہ کیا خیال کرے گا۔

مکان میں ابھی کچھ مرمت رہ گئی تھی۔ دو چار دن کے بعد اس کام کے لیے مزدور لگے پر دے

کی بڑی تکلیف ہوگئی۔ ڈاک بنگلہ ان دنوں خالی پڑا تھا۔ بیوی بچوں کو کچھ دنوں کے لیے اس میں لے گئے۔ یہ بنگلہ بہت خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ ضرورت کی ساری چیزیں اس میں موجود تھیں۔ ہال میں خوبصورت فرش لگا تھا۔ بیچوں بیچ ایک میز اور چار پانچ کرسیاں تھیں۔ کمروں میں عمدہ نواڑی کے پلنگ لگے تھے۔ ہر کمرے میں ایک میز تھی۔ اس پر ایک صندوقچہ سنگار دان مع آئینے کے لگا ہوا تھا۔ طشتری میں صابن رکھا ہوا تھا۔ تیل کنگھا موجود تھا۔ دراز میں کئی سفید تولیے رکھے تھے۔

سکینہ بیگم یہ سارا سامان دیکھ کے بہت خوش ہوئیں۔ میاں سے بولیں کہ تم نے ہمیں وہاں ڈربے میں جو ڈال رکھا ہے تو یہاں لا کے کیوں نہیں رکھتے۔

فدا حسین: ڈاک بنگلہ ہمارے رہنے کے لیے نہیں۔ اس میں خود مرزا صاحب آ کے رہتے ہیں یا جب کوئی انگریز دورے پر آتا ہے تو وہ یہاں ٹھہرتا ہے۔

سکینہ بیگم: ان دنوں تو یہ خالی پڑا ہے اور بھائی صاحب کا کیا ہے۔ جب آئیں گے تو رات کی رات رہ جائیں گے اور اگر دو چار دن رہیں بھی تو نہ انہیں تکلیف ہوگی اور نہ ہمیں۔ جب کوئی انگریز افسر آئے تو بنگلہ خالی کر دیں گے۔ وہ بھی کوئی ہمیشہ تھوڑا ہی رہے گا۔ رات کی رات رہ کر چلا جائے گا۔

فدا حسین: نہیں ہمارا رہنا یہاں مناسب نہیں۔ جو مکان رہنے کے لیے دیا گیا ہے قاعدے کے مطابق اسی میں رہنا چاہیے۔

سکینہ بیگم: یہ اچھی کہی کہ ہمارا رہنا مناسب نہیں۔ اچھا خاصا بنگلہ چھوڑ کے وہاں مرغیوں کی ڈھابلی میں جا کے رہیں۔

فدا حسین: اگر ہماری قسمت میں ڈھابلی ہی لکھی ہے تو ہم بنگلے میں کیسے رہ سکتے ہیں۔

سکینہ بیگم: مرغیوں کی ڈھابلی لکھی ہوگی تمہاری قسمت میں۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔

دیکھیں ہمیں کون نکالتا ہے۔ یہ تو میں خوب جانتی ہوں کہ چھوٹے بھیا کا مزاج ایسا نہیں ہے بس ان کی بیوی بس کی گانٹھ ہے اور اسی پر اس کا بیٹا باقر پڑا ہے۔ چھوٹے بھیا بیوی سے ڈرتے ہیں۔ جتنے نیک آدمی ہیں وہ بیویوں سے ڈرتے ہیں اور ان کے کہے پر چلتے ہیں۔ جتنے بُرے مرد ہوتے ہیں وہ بیویوں کے سر پر جوتا رکھتے ہیں۔ یہ سارا کیا دھرا چھوٹی بھابی کا ہے۔ چار پیسے کیا ہو گئے کہ دماغ نہیں پائے جاتے۔ وہ دن بھول گئیں جب سوئیاں بھونکتی تھیں تو رات کو روٹی نصیب ہوتی تھی۔ اپنے بُرے دن کسی کو یاد نہیں رہتے۔

فدا حسین : چھوٹی بھابی تو بس کی گانٹھ نہیں۔ زہر بھری تو تمہاری زبان ہے جو کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ مجھے اندازہ ہے کہ کیا حالات پیش آئے ہوں گے۔ چھوٹے بھیا نے جس وقت مجھ سے الگ ہونے کو کہا ہے اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

سکینہ بیگم : میں بھی تو کہتی ہوں کہ چھوٹے بھیا ایسے نہیں۔ سب کچھ کیا دھرا چھوٹی بھابی اور باقر کا ہے۔

فدا حسین : باقر تو ایسا نیک لڑکا ہے کہ مشکل ہی سے ملے گا۔ خدا سب کو ایسی اولاد دے۔ ایک یہ ہمارا مردود لونڈا ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا مگر اسے بات کرنے کی ذرا بھی تمیز نہیں۔

سکینہ بیگم : واہ بڑے آئے لونڈا کہنے والے۔ میں نے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ میرے بچوں کو ہونسامت کرو۔ میرے ذاکر میں آخر کیا بُرائی ہے۔ پڑھنا لکھنا تقدیر سے ہے۔ باقر نے ذرا سا پڑھ لکھ کیا لیا وہ غزور ہے کہ اللہ اللہ۔ باپ بیچارے تو جب گھر میں آتے تھے مجھے جھک جھک کے سلام کرتے۔ مگر میاں باقر کا یہ حال ہے کہ نہ کسی کی پوچھ نہ گچھ۔

فدا حسین : باقر بیچارہ بچپن سے باہر رہا۔ وہ عزیزوں کنبہ داروں کو کیا جانے۔ اسے کیا خبر تم کون بلا ہو؟

سکینہ بیگم : ذرا اپنی زبان کو دیکھو۔ تم کون بلا ہو؟ بلا ہو گے تم۔ بھوت پلیت ہو گے

تم اور تمہارے ہوتے سہاتے۔

فدا حسین: اچھا میں سب کچھ سہی مگر تم چھوٹی بھابی اور باقر کے بارے میں ایسی گفتگو نہ کرو۔

سکینہ بیگم: تم کرو ان کی غلامی۔ ہم تو جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں۔

فدا حسین: اگر ہم شریف ہیں تو ضرور ان کی غلامی کریں گے۔ چھوٹے بھیّا نے ہمارے ساتھ وہ احسان کیا ہے کہ ہم ساری عمر سر نہیں اٹھا سکتے۔ اور تم ایسی بے احسانی ہو کہ ان کے بچوں تک سے جلتی ہو۔

سکینہ بیگم: موئی پندرہ روپلّی کے لیے تم جوتیاں کھاؤ۔ ایسا کیا بڑا کام کر دیا۔ عزیز کنبے دار ہوتے اسی لیے ہیں۔ اور ایسی کیا نوکری دلا دی شہر چھڑایا، گھر بار چھڑایا اور تنخواہ کون سی انہیں اپنی گرہ سے دینی پڑتی ہے۔ بس سرکار کے رجسٹر میں نام لکھوا دیا ہے۔ اتنا احسان کیا ہے۔

فدا حسین: خیر یہ ساری بات تو الگ رہی۔ تم اس بنگلے میں نہیں رہ سکیتں۔

سکینہ بیگم: پھر تم نے وہی بات نکالی۔ اگر تمہاری ضد ہے تو ہم بھی تمہاری ضد سے یہیں رہیں گے۔

فدا حسین: تم تو ایسے بات کرتی ہو جیسے یہ تمہارے یا میرے باپ کا مکان ہے۔ کیا زبردستی ہے کہ ہم تو یہیں رہیں گے۔ جھوٹا پکڑ کے باہر نکال دی جاؤ گی۔

سکینہ بیگم: واہ یہ اچھی رہی کہ تم باپ تک پہنچ جاتے ہو۔ تو انگریز ہمارے باپ ٹھہرے اور جھوٹا پکڑ کے نکالی جائیں تمہاری اماں بہنا۔ مجھ سے اس طرح کلام نہ کرنا۔ نہیں تو اپنا منہ پیٹ لوں گی۔

فدا حسین: بُرا کیوں مانتی ہو۔ میں نے اپنے باپ کو بھی تو کہا۔ میری اماں بہنا جب کسی کے گھر ڈٹی دیں گی تو وہ بھی نکالی جائیں گی۔ اور بھئی منہ پیٹنے کی بات یہ ہے کہ شوق سے پیٹو

تمہارا ہی منہ دُکھے گا، میرا کیا نقصان ہے۔

میاں کا یہ جواب سن کے سکینہ بیگم کچھ ایسے طیش میں آئیں کہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ ڈالا اور ایسا فیل مچایا کہ دور تک آواز پہنچی۔ مکا چوکیدار اور مزدور جو باہر کام کر رہے تھے سمجھے کہ بنگلے میں سانپ نکل آیا۔ سب لٹھ لے کے دوڑے۔ فدا حسین بیچارے نے کسی طرح بات بنائی۔

مختصر یہ کہ سکینہ بیگم بڑی ہی ضدی عورت تھیں۔ انہوں نے آخر بنگلہ نہیں چھوڑا اور دو چار دن میں ہی اس کی حالت تباہ کر دی۔ دیواروں پر جگہ جگہ پیک کے دھبے ڈال دیے دریوں اور قالینوں پر پتیلیوں کے پیندوں کے نشان ڈال دیے۔ جگہ جگہ تیل کے چکتے دکھائی دینے لگے۔ بچوں نے کود کود کے پلنگوں کو جھولا کر دیا۔ فرشی پنکھے کا ذاکر اور ہرمزی نے جھولا بنایا اور آخر ایک دن وہ گر ہی پڑا۔ سنگار میز کا آئینہ اور دروازوں کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ کرسیوں کے ہتھے ٹوٹے، میزوں کی پالش خراب ہوئی۔ تولیے سالن کے ہاتھ پونچھ پونچھ کے کالے چکٹ کر دیے۔ غرض ڈاک بنگلے کا کباڑ خانہ بنا کے رکھ دیا۔ انہی دنوں میں بڑے انجینیر صاحب کا دورے پر آنا ہو گیا اور انہیں جلدی جلدی بنگلہ خالی کرنا پڑا۔

صاحب نے بنگلے کا یہ حال دیکھا تو بہت ناراض ہوا۔ فدا حسین کو بلا کے بہت ڈانٹا دس روپے جرمانہ کیا اور ان کے خلاف سروس بک میں نوٹ دے دیا کہ آئندہ ایسی حرکت کرے تو نوکری سے نکال دیا جائے۔ اس واقعے کے بعد میاں بیوی میں بڑی سخت گفتگو رہی۔ مکا چوکیدار کی بیوی سے بھی ایک دن جھگڑا ہو کے رہی۔

اتنے میں محرم قریب آگیا۔ فدا حسین نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر ایک مہینے کے لیے گھر گئے۔ چھٹی ختم ہونے کے بعد خود تو لوٹ آئے اور بیوی کو وہیں چھوڑ آئے۔ اس کے بعد بہت دنوں نوکری کی مگر بیگم صاحب کو بلانے کا نام نہ لیا۔ بہتیری تکلیفیں اٹھائیں مگر وہ انہیں ساتھ رکھنے سے کم تھیں۔ ذاکر کو ہونہار دیکھ کر مرزا صاحب نے اپنے

پاس رکھ لیا تھا۔ تھوڑا پڑھنے کے بعد وہ ٹھیکہ داری کرنے لگا جس سے خاندان کی حالت بہتر ہو گئی۔

مرزا صاحب پر جب مقدمہ قایم ہوا تو مرزا فدا حسین نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور ایسی محنت سے پیروی کی کہ مرزا صاحب صاف بُری ہو گئے۔ دشمنوں کو قید ہوئی۔

مرزا صاحب کی توجہ سے ایک اور بگڑا ہوا کارخانہ سُدھرا۔ اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہے اس لیے ہم وہ بھی سنائے دیتے ہیں۔ مرزا صاحب اودھ کے ایک ضلعے میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے۔ سرائے میں جا کے اترے۔ چھوٹی سی جگہ تھی اس لیے سب کو معلوم ہو گیا۔ بہت سے لوگ ملنے کو آئے۔ ان میں ایک صاحب فدوی میاں بھی تھے۔ یہ اس بستی کے بگڑے ہوئے رئیس تھے۔ کبھی بڑی جاگیر تھی۔ مگر اب سب کچھ ان کے کارندے شیو رتن کے پاس تھا۔

شیو رتن فدوی میاں کے گھر میں ہی پلا بڑھا تھا مگر اب وہی ساری جائیداد کا مالک تھا۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ شاید پرانا نمک خوار ہونے کی وجہ سے فدوی میاں کا تھوڑا بہت خیال رکھتا تھا۔ فدوی میاں کی ان کے علاقے میں خاصی عزت تھی۔ حاکموں تک بھی ان کی رسائی تھی۔ شیو رتن کا کوئی کام پھنستا تو ان ہی کی معرفت ہوتا۔

فدوی میاں کا اصلی نام فدا علی تھا۔ وہ اپنا تخلص فدوی بتاتے تھے۔ مگر اصلیت یہ نہ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ وہ کسی زمانے میں اپنے بارے میں لفظ فدوی بہت استعمال کیا کرتے تھے مثلاً "فدوی کا یہ خیال ہے۔ فدوی کل بھی حاضر ہوا تھا۔ فدوی کی عرض یہ ہے۔" تو صاحب لوگوں نے ان کا نام ہی فدوی رکھ دیا۔ انہوں نے بھی مصلحت سے کام لیا اور اسے تخلص کے طور پر اختیار کر لیا۔

مرزا صاحب میل ملاقات سے بہت گھبراتے ہیں۔ لمبے دار گفتگو نہ ان کے بس کی بات ہے اور نہ وہ پسند کرتے ہیں مگر جب کوئی آ ہی جائے تو ملاقات تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ مرزا صاحب سرائے میں آ کے بیٹھے ہی تھے کہ یہ نازل ہو گئے۔ تعارف کے بعد اس طرح گفتگو

شروع ہوئی۔

فدوی میاں: آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو فدوی کو ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ یہاں حاکموں میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب: جی ہاں بعض صاحبوں کو ملاقات کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں: جناب! شوق کیا ایک لت سی ہوگئی ہے۔ آپ جانئیے یار باشی میں تو وہ مزہ ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب: آپ صحیح فرماتے ہیں۔ جس کو جس بات کا شوق ہو جائے۔ اگر اس میں کتنا ہی وقت برباد ہو مگر شوق مشکل سے ہی چھوٹتا ہے۔

فدوی میاں یا تو یہ اشارہ سمجھے نہیں یا سمجھے تو ٹال گئے۔ کچھ تو بات تھی کہ وہ ملے بغیر کسی کو چھوڑتے نہ تھے۔ ایسے ایسے حاکم بھی آئے جو ملاقات سے نفرت کرتے تھے۔ کوئی ملنے آیا اور یہ ڈنڈا لے کے دوڑے مگر فدوی میاں ایسوں کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ جیمس صاحب آدمیوں سے دور بھاگتے تھے مگر فدوی میاں کے ان سے تعلقات ہو گئے۔ ڈپٹی بہادر حسین خاں صاحب نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ کے لگا دی تھی کہ کوئی مجھ سے ملاقات کو نہ آئے مگر فدوی صاحب وہاں بھی پہنچ گئے اور آخر اتنا رسوخ بڑھایا کہ ان کا پیچوان پیا، ان کے خاصدان سے پان کھایا۔ خیر تو اب باقی گفتگو سنیے۔

فدوی میاں: یہاں سرائے میں تو آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔

مرزا صاحب: جی ہاں ابھی کل ہی تو آیا ہوں۔ مکان تلاش کر کے اٹھ جاؤں گا۔

فدوی میاں: فدوی کے ان گنت مکانات ہیں۔ بہت سے خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اس میں اٹھ چلیے۔

مرزا صاحب: (ذرا دیر سوچنے کے بعد) کس کرائے کے مکان ہیں۔

فدوی میاں: (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں۔ دیہات میں اسے عیب سمجھتے ہیں۔

مرزا صاحب : مگر میں عیب اس میں سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان میں رہوں۔

فدوی میاں : کسی غیر کا مکان ہو تب نا۔

مرزا صاحب کو یہ جواب عجیب سا لگا۔ وہ یہ کہنے ہی کو تھے کہ میری آپ کی کب کی شناسائی ہے کہ ان کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت پنڈت جانکی پرشاد صاحب آ گئے۔ یہ یہاں کے تھانیدار تھے۔ مرزا صاحب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ فدوی میاں اور پنڈت جی سے نہ صرف شناسائی ہے بلکہ بے تکلف ملاقات ہے۔ پنڈت جی نے بھی یہی مشورہ دیا کہ فدوی میاں کے کسی مکان میں اٹھ جائیے۔ ان کے اس مشورے سے اتنا تو اندازہ ہوا کہ فدوی میاں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

فدوی میاں کسی ضرورت سے اٹھ کر باہر گئے تو پنڈت جی نے بتایا کہ مکانات اب اصل میں شیو رتن کے ہیں۔ یہ کسی وقت میں ان کا کارندہ تھا اس لیے اب بھی یہ اسی طرح بات کرتے ہیں جیسے مکان ان ہی کے ہوں۔ پنڈت جی نے پھر یہی مشورہ دیا کہ شیو رتن کے مکان میں اٹھ جانا چاہیے۔ رہی بات کرائے کی تو اگر کرایہ نہ لیں گے تو دوست کا حساب دل میں کسی اور طرح معاملہ ہو جائے گا۔ یہ آخری بات مرزا صاحب کی سمجھ میں تو نہ آئی مگر چپ ہو رہے۔

مرزا صاحب : یہ تو فرمائیے کہ یہ فدوی میاں میرا وقت تو برباد نہ کریں گے۔ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت جی : ایسے لوگ جو حاکموں سے ملتے رہتے ہیں وہ حاکموں کا مزاج خوب سمجھ جاتے ہیں۔ آئیں گے تو یہ ضرور چاہے ان کے مکان میں رہیئے یا نہ رہیئے۔ آپ منہ نہ لگائیں گے تو دو چار منٹ بیٹھ کر اٹھ جایا کریں گے۔ ایسے لوگوں سے ایک فائدہ اور ہوتا ہے کیسی ہی چیز کی آپ کو ضرورت ہو یہ ذرا سی دیر میں مہیا کر دیتے ہیں۔ آپ کو گھوڑا چاہیے۔ یہ کفایت سے دلا دیں گے۔ غلہ، گڑ، گھی، اب جس چیز کی ضرورت ہو فراہم کر دیں گے۔ پلنگ، میز

کرسیاں، برتن باسن سب ان سے ہی منگوائیے گا۔

مرزا صاحب: مگر ان چیزوں کی قیمت دُوگنی تو وصول نہیں کرتے۔

پنڈت جی: نہیں صاحب، قیمت تو بس یہ دینی ہوگی کہ تھوڑا وقت ضایع کرانا ہوگا۔

مرزا صاحب: خیر وقت کی بات چھوڑیے۔ ایسے آدمی سے تعلق رکھنے میں کئی طرح کے پیچ پڑ سکتے ہیں۔

پنڈت جی: اجی پیچ دپیچ کچھ نہیں پڑتے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایک اچھا مکان خالی ہے۔ اس مکان میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے۔ ان کا تبادلہ ہوگیا۔ اگر آپ نے نہ لیا تو کوئی اور لے لے گا۔

مرزا صاحب: آپ کہتے تھے اب فدوی میاں کے مکانوں کا مالک کوئی کارندہ ہے۔ میں اس سے بات کرلوں گا اور اسے کرایہ لینے پر آمادہ کرلوں گا۔

اتنے میں فدوی میاں پھر آموجود ہوئے۔ پنڈت جی اور فدوی میاں کے اصرار پر مرزا صاحب مکان دیکھنے کو راضی ہوگئے۔ پنڈت جی کی ٹم ٹم سرائے میں موجود تھی۔ مرزا صاحب ور پنڈت جی دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ پیچھے فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ آیا تھا دونوں بیٹھ گئے۔ فدوی میاں حوالدار سے گھل مل کے باتیں کرتے تھے وہ بیچارہ پنڈت جی کی وجہ سے جتنا لحاظ کرتا فدوی میاں اتنی ہی بے باکی سے گفتگو کرتے۔

راستے میں کئی سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہوگا۔ ہر دس قدم کے بعد آواز آتی 'فدوی میاں سلام، فدوی میاں سلام'۔ جو نظر آتا پہلے تھانیدار صاحب کو جھک کر ادب سے سلام کرتا۔ یوں سمجھیے کہ یہ اول درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو ہوتا۔ وہ بھی جھک کے مگر ذرا کم جھک کے۔ اور پہلے سلام کی طرح ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بغیر آواز کے۔ تیسرا سلام حوالدار صاحب کو ہوتا۔ بغیر جھکے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے مگر آواز کے ساتھ 'حوالدار صاحب سلام'۔ چوتھے درجے کا سلام فدوی میاں کو ہوتا۔ بغیر

جھکے اور بغیر ماتھے پر ہاتھ رکھے صرف آواز کے ساتھ "فدوی میاں سلام" وہ بھی اسی طرح نام لے کر جواب دیتے یا کہتے "بھیّا سلام"، "مہتو سلام"، سلام کا جواب دے کر فدوی میاں خیریت بھی پوچھتے جاتے۔

تھوڑی دیر میں ٹم ٹم اس مکان کے سامنے پہنچ گئی جسے مرزا صاحب دیکھنا چاہتے تھے۔ مکان واقعی اچھا اور رہنے کے قابل تھا۔ زنانہ مکان پختہ اور دو منزلہ مردانہ مکان عمدہ اور کشادہ سامنے بڑا سا احاطہ اور ایک طرف کھپریلیں تھیں جو گاڑی، گھوڑے، سائیس اور خدمت گاروں کے لیے تھیں۔ جگہ جگہ درخت اور پودے تھے جن میں کوئی ترتیب نہ تھی۔ بالنس کا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ مکان مرزا صاحب کو پسند آیا۔

شیو رتن بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ کالے رنگ کا ایک آدمی تھا۔ دھوتی بندھی ہوئی، اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے ہوئے۔ اسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی، پاؤں میں چرا ودا جوتا گلے میں بٹوہ پڑا ہوا۔ یہ تھا آپ کا درباری لباس کیونکہ آپ سیدھے کچہری سے چلے آتے تھے۔ تھانے دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سنی تو کچہری سے دوڑے چلے آئے۔ کرائے کی بات ہوئی تو فدوی میاں ٹل گئے۔ سات روپے مہینہ کرایہ طے ہوا۔ اسی دن مرزا صاحب کا سامان اس مکان میں آگیا۔ دو پلنگ اور تین کرسیاں فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں اور مرزا صاحب کو قبول کرنی پڑیں۔ مکان آراستہ کیا گیا تو فدوی میاں موجود تھے جو موقع بے موقع دخل دیتے رہے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو مانگے بے مانگے ہر وقت مشورہ دینے کو موجود ہوتے ہیں۔

مرزا صاحب نے گھوڑا خریدا تو بھی فدوی میاں کا مشورہ شامل رہا۔ مرزا صاحب ان سے بچنے کی ہزار کوشش کرتے تھے مگر فدوی میاں بھلا کہاں چھوڑنے والے تھے۔ ان کے خلوص کا مرزا صاحب پر اثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فدوی میاں بھی مرزا صاحب سے ڈرتے تھے اور ان کی ہر بات کو حکم سمجھتے تھے۔ یہ تو فدوی میاں کو مرزا صاحب سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ

وہ آمدنی جو "اوپر کی آمدنی" کہلاتی ہے حرام ہے لیکن فدوی میں اور بہت سی خوبیاں تھیں۔ روزے نماز کے وہ پابند تھے۔ حرام چیزوں سے وہ بچتے تھے۔ کسی کو دھوکہ دینا بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ انہیں یہ بات بھی مرزا صاحب سے ہی معلوم ہوئی کہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں ناچ گانا کرانا گناہ ہے۔ انہیں انعام دینا بھی بُری بات ہے۔ ورنہ وہ جانے کتنی ناچنے والیوں کو انعام سے مالا مال کر چکے تھے۔

فدوی میاں میں کچھ ایسی عادتیں جڑ پکڑ چکی تھیں جن کا دُور کرنا مشکل تھا۔ حاکموں کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی۔ سعی سفارش۔ بات بے بات جھوٹ بولنا جھوٹی قسمیں کھانا فحش اور بے تکا مذاق کرنا، بدمعاشوں کی طرفداری کرنا اس طرح کے عیب ان میں ضرور موجود تھے لالچ البتہ ان کے مزاج میں نہ تھی۔ اب تو کنگال تھے لیکن فضول خرچ بھی اوّل درجے کے تھے ان کے دو بیٹے تھے ایک کوئی چودہ برس کا نثار علی اور دوسرا کوئی سات آٹھ برس کا احمد حسن۔ نثار علی کافی بگڑ چکا تھا مگر حیا اس میں بہت تھی اور وہی اس کی دُرستی کا سبب بن گئی۔

اپنے لڑکوں کی تعلیم کی طرف فدوی میاں توجہ نہ دیتے تھے۔ ایک مولوی صاحب بچوں کو پڑھانے کے لیے برسوں سے مقرر تھے۔ مگر لڑکے کورے کے کورے تھے۔ بڑا لڑکا گلستاں کا پہلا باب ہی ختم نہ کر پایا تھا۔ چھوٹا ابھی تک بغدادی قاعدے سے آگے نہ بڑھا تھا۔ مرزا صاحب کو فدوی میاں کے معاملات سدھارنے کا اتنا خیال تھا کہ وہ ان کے گھریلو معاملات میں بھی دخل دینے لگے اور فدوی میاں رفتہ رفتہ اپنی ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب ان کے محافظ اور نگراں ہو گئے۔ اس بات سے شیورتن بہت خوف زدہ سا رہنے لگا۔ اس سے مرزا صاحب کے دل میں شک پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو دال میں کچھ کالا ہو۔ مرزا صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ "شیورتن کے برتاؤ سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس نے فدوی میاں کے معاملات میں کچھ ہیرا پھیری کی ہے، مگر انہوں نے کسی پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

شیورتن بوڑھا آدمی تھا اور فدوی میاں کے والد کے زمانے میں ان کے کسی علاقے کا ضلع دار تھا۔ جب فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد نے انتقال کیا تو ان کی عمر بہت کم تھی۔ اس لیے ان کے ماموں شیخ فدا علی سرپرست مقرر ہوئے۔ یہ بڑے مشہور جعل ساز تھے۔ ان کی سرپرستی کے زمانے میں بھی شیورتن کارکن رہا۔ مرزا صاحب کو اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ شیخ احمد اور شیورتن کی سازش سے کوئی جعل ہوا ہے۔ کیا جعل ہوا ہے یہ معلوم نہ ہو سکا۔

مرزا صاحب کا بیان ہے کہ وہ اصل معاملے کی تہ کو پہنچنے کے لیے بے چین تھے اور شیورتن کی ذرا ذرا سی حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ رات دن وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں جو معلومات انہوں نے جمع کیں ان کا خلاصہ یہ تھا:

فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد کا لکھنؤ میں انتقال ہوا تھا۔ یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ کسی وبائی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ والدہ کا انتقال ان سے بھی پہلے ہو چکا تھا اور شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔ قربان محمد ایک مقدمے کے سلسلے میں لکھنؤ گئے تھے۔ مقدمے کی صورت یہ تھی کہ ایک راجپوت ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں قربان محمد کے علاقے پر دعویٰ کیا تھا۔ حاکم بندوبست نے یہ دعویٰ خارج کر دیا تھا۔ پھر اس نے تجری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اس نے اپیل کی۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ اب اس نے دوبارہ اپیل کی۔ لوگوں کے اندازے کے خلاف اب کی بار وہ مقدمہ جیت گیا۔

جس دن قربان محمد کے خلاف فیصلہ ہوا اسی دن ان کا انتقال ہو گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ اپیل جیتنے کے بعد ماندھاتا کو جائیداد پر قابض ہونا چاہیے تھا مگر قابض ہوئے شیخ احمد اور شیورتن۔ شیورتن شاید پچھلے دنوں کا خیال کر کے فدوی میاں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کر دیا کرتا تھا۔

مرزا صاحب برابر چھان بین کرتے رہے اور جب معاملے کی تہ کو پہنچ گئے تو مجھے بلا کے

ساری صورت حال سمجھائی۔ اگلے دن اتوار تھا۔ مرزا صاحب دیوان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ فدوی میاں سے میری ہنسی مذاق کی گفتگو ہو رہی تھی۔ اچانک مرزا صاحب نے اردلی کو حکم دیا کہ شیورتن کو بلا لاؤ۔ یہ غالباً پہلا موقعہ تھا کہ شیورتن کو بلایا گیا تھا۔ اس پر فدوی میاں کو بھی ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ذرا دیر میں شیورتن حاضر ہو گیا۔ مرزا صاحب نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دو چار غیر ضروری باتیں کیں۔ اس کے بعد میری طرف مخاطب ہوئے۔

مرزا صاحب : ہاں تو ولایت علی خاں مر گیا ؟

(ولایت علی خان کا نام سنتے ہی شیورتن کا رنگ فق ہو گیا اور جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا)

میں : جی ہاں مر گیا۔ اسے مرے ہوئے کوئی دو مہینے ہوئے ہوں گے۔

مرزا صاحب : آپ اس سے واقف تھے۔

میں : جی ہاں خوب اچھی طرح۔ کٹارے ٹولی کے برابر جو گلی کالکوں کی طرف جاتی ہے اس میں نیم کے پیڑ کے سامنے .....

مرزا صاحب : ہاں ہاں۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کس بُری گت سے مرا ہے۔

میں : دھوکہ دینے اور اللہ کے بندوں کا حق چھیننے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مرزا صاحب : سنتے ہیں لاوارث مال پولیس نے دفن کیا ہوگا اور مرنے کے بعد سامان بھی پولیس نے قبضے میں لے لیا ہوگا۔

میں : یہی ہوا اور اس کے سوا ہو کیا سکتا تھا ؟

مرزا صاحب : اور اس تکیے کا کیا ہوا جو اس کے سرہانے رہا کرتا تھا ؟

میں : اس کا حال پھر عرض کروں گا۔

اس کے بعد مرزا صاحب اور میں اِدھر اُدھر کی گفتگو کرنے لگے مگر اس کی سٹی گم رہی

اگلے دن پتہ چلا کہ شیو رتن رات ہی کو لکھنؤ گیا تھا۔ مرزا صاحب نے ایک آدمی اس کا پیچھا کرنے کے لیے پہلے ہی سے مقرر کر دیا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ شیو رتن امین آباد کی سرائے میں اُترا۔ وہاں سے چوک کی طرف روانہ ہوا اور گول دروازے کے قریب بان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا۔ وہاں سے کچھ پوچھ کے ایک تاریک گلی میں گیا۔ کافی دُور چل کے ایک چبوترے کے قریب پہنچا۔ وہاں سے ایک آدمی نکلا۔ اس سے کچھ معلومات کیں۔ پھر کئی دن تک گلیوں کی خاک چھانی مگر شاید کچھ کام نہ بنا اور تکیے کا پتہ نہ چلا۔ کیسے چلتا وہ تکیہ جس میں شیو رتن کی جان تھی وہ پہلے ہی ہمارے قبضے میں آچکا تھا۔

اب آپ یہ جاننے کے لیے بیتاب ہوں گے کہ آخر یہ راز تھا کیا۔ آئیے اب ہم اس راز کے چہرے سے نقاب اٹھائے دیتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ ماندھاتا لکھنؤ سے بھی مقدمہ ہار گیا تھا۔ اتفاق سے اسی دن شیخ قربان محمد کا انتقال ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی سازش کی گئی ہو اور اس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوئی ہو مگر اب اتنے دنوں بعد اس کا سراغ ملنا مشکل ہے۔

شیخ قربان محمد کے انتقال کے بعد شیخ احمد اور شیو رتن نے دھوکے بازی سے کام لیا اور ولایت علی خاں جو ایک مشہور جعل ساز تھا۔ اس سے اصل فیصلے کی جگہ ایک جعلی فیصلہ لکھوا لیا جو ماندھاتا کے حق میں تھا۔ ماندھاتا اپنے حصے کا روپیہ لے کر الگ ہو گیا اور جائیداد شیو رتن کے نام بیع کر دی۔ شیخ احمد کی کوئی مالی حیثیت نہ تھی اس لیے اس کے نام بیع نامہ ہو نہ سکتا تھا۔ شیو رتن روپے کا لین دین کرتا تھا اس لیے پیسے والا بھی تھا اور شہرت بھی یہی رکھتا تھا۔

اصل فیصلہ جو شیخ قربان محمد کے حق میں تھا وہ ولایت علی نے دبا رکھا تھا اور جب ضرورت ہوتی خط لکھ کے اور دھونس ڈپٹ کے شیو رتن سے کچھ نہ کچھ منگا لیا کرتا تھا۔ ایک بار مرزا صاحب کی ڈاک میں شیو رتن کے نام کا خط چلا آیا۔ ولایت علی خاں کا نام اوپر ہی

لکھا تھا۔ مرزا اسے خوب جانتے تھے اس لیے فوراً شک ہوا۔ پڑھا تو لکھا تھا کہ "شیو رتن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ ہماری کچھ مدد کرو اور کاغذات ہم سے لو ورنہ مرتا کیا نہ کرتا۔"

مرزا نے وہ خط دبا لیا اور شیو رتن کی طرف سے ایک آدمی پچاس روپے کر ولایت علی خاں کے پاس گیا۔ اس نے اپنے تکیے میں سے کاغذ نکال کر اس کے حوالے کر دیے اور کچھ ہی دن بعد دوزخ میں جا پہنچا۔ شیو رتن حیلے بہانے کے بغیر جائیداد سے دست بردار ہو گیا۔ مرزا اسے جیل بھجوا سکتے تھے مگر انہوں نے مقدمہ بازی کی لمبی کارروائی سے بچنے ہی کو بہتر سمجھا۔ اب فدوی میاں رئیس بن گئے مگر مرزا صاحب کو ابھی تک اسی طرح مانتے جاتے ہیں اور ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔